جلد ۸۲ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۸ء نمبر ۶

مضامین

چھوٹ بھی گئے ہیں، جس مقصد کیلئے انتخاب کیا گیا ہے اس کے لیے مفید ہے۔

"ض"

جلد ۸۲ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۸ء نمبر ۶

مضامین

چھوٹ بھی گئے ہیں جس مقصد کیلئے انتخاب کیا گیا ہے اس کے لیے مفید ہے۔

"ض"

شذرات

ہم نے ان صفحات میں بارہا حکومت اور فرقہ پرست ہندوؤں کی شکایت کی ہے، مگر آج اس سلسلہ میں مسلمانوں سے بھی چند باتیں کہنی ہیں، یہ تسلیم ہے کہ حکومت میں فرقہ پرستوں کا غلبہ ہے، اور جمہوری حکومت میں فیصلہ اکثریت کے اختیار میں ہوتا ہے، اس لیے اصولاً مسلمانوں کے جو حقوق بھی ہوں لیکن حکومت کا عمل اکثر معاملات میں مسلمانوں کے خلاف ہوتا ہے اور اس سے انکو ہر طرح کی شکایتیں ہیں جو بالکل صحیح ہیں لیکن یہ تسلیم کرنے کے باوجود اسکی ذمہ داری سے مسلمان بھی بری نہیں ہیں، ہم ان کو وفاداری اور قوم پروری کا درس نہیں دیتے، یہ چیز بہت پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے، مسلمان اس سطح سے بلند ہو کر اپنی مشکلات کا حل نکال سکتے ہیں۔

جب مسلمان اس ملک میں آئے تھے تو انکی تعداد چند لاکھ سے زیادہ نہ رہی ہوگی اور اس زمانہ کے ہندو آجکل کے ہندوؤں سے زیادہ کٹر تھے، انکو بیرونی قوموں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، اور وہ غیر مذاہب والوں کے سایہ سے بھی بھڑکتے تھے، پھر مسلمانوں کا مذہب اس زمانہ کے مروجہ ہندو مذہب کے بالکل خلاف تھا، اس میں توحید خالص تھی، توہم پرستی، انسانوں کی طبقاتی تقسیم اور انکی غلامی کی مخالفت اور انسانی شرف و عظمت اور اخوت و مساوات کی تعلیم تھی، عورتوں کے حقوق تھے، مسلمان گائے کا گوشت کھاتے تھے جسکو ہندوستان میں تقدس کا درجہ حاصل ہے، غرض اسلام کی بہت سی چیزیں ہندو مذہب کے بالکل ضد تھیں، اس کے باوجود مسلمان نہ صرف ہندوستان پر چھا گئے، بلکہ ہندو معاشرہ اور ہندو مذہب تک کو اسلامی اثرات سے متاثر کر دیا، گو خود بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔

یہ تلوار کی قوت نہ تھی، اگر تلوار کی قوت ہوتی تو کم سے کم اسلامی حکومتوں کے دارالسلطنتوں کے علاقے پورے کے پورے مسلمان ہوتے یا ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی، حالانکہ آج بھی ان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، پھر ہندو جیسی غیور اور قدامت پرست قوم سے اسکی توقع بھی نہیں کہ وہ تلوار کے خوف سے اپنا مذہب بدل دیتی، حکومت کے اقتدار کا بھی اثر نہ تھا، حکومت کا اقتدار صرف تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوتا ہے، ہزاروں برس کے راسخ عقائد کو نہیں بدل سکتا جب تک کہ حکمراں قوم کے مذہب میں اثر و نفوذ کی صلاحیت نہ ہو، اس لیے یہ صرف اسلام کی سادہ، فطری اور سچی تعلیمات کی تاثیر اور اسلامی اخلاق کی قوت تھی جس نے ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا، ہندوستان کی سرزمین توحید اور انسانی آزادی و مساوات کی پیاسی تھی، اس لیے اسلام کے ابر کرم کا چھینٹا پڑتے ہی اسکی کھیتی لہلہا اٹھی، سیکڑوں استھانوں پر جھکنے والی پیشانیاں ایک خدائے قدوس کے سامنے جھک گئیں اور ہندوؤں کے وہ مظلوم و مقہور طبقے جو ہزاروں برس سے غلامی اور ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے کرتے تھک چکے تھے، اسلامی مساوات کے دامن میں پناہ لینے لگے، ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد انہی کی یادگار ہے۔

دوسری طاقت جو پہلی طاقت کی عملی شکل تھی، اسلامی اخلاق و روحانیت کی تھی، اور یہاں مسلمانوں خصوصاً ان صوفیائے کرام نے جو شریعت و طریقت کے جامع تھے، اسلامی اخلاق و سیرت کا ایسا نمونہ پیش کیا جو دلوں میں گھر کر گیا، اور ہر دور میں اکابر صوفیہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اسلامی اخلاق و روحانیت کی روشنی پھیلاتے رہے، اور نہ صرف ہندو عوام بلکہ انکے خواص اور اونچا طبقہ بھی ان کے ہاتھوں پر کثرت سے مشرف باسلام ہوا، اور آج ہندوستان میں اسلام کی جو روشنی نظر آتی ہے وہ زیادہ تر انہی نفوس قدسیہ کا فیض ہے، اور ان کی روحانیت کا آج بھی یہ اثر ہے کہ جس طرح مسلمان انکے آستانوں پر احترام و عقیدت کی نذر پیش کرتے ہیں، اسی طرح ہندو بھی کرتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آج ہم میں نہ وہ اسلامی روح باقی ہے اور نہ وہ نفوس قدسیہ ہیں، جن کے انفاس گرم سے مردہ دلوں میں حرارت پیدا ہو جاتی تھی، مگر اسلام کی پاکیزہ تعلیمات تو آج بھی ویسی ہی ہیں

ع ہنوز آں ابر رحمت درفشان است

یہ مانا کہ آج ہندوؤں میں کچھ فرقہ پرست جماعتیں ایسی ہیں جن کو کسی حال میں مسلمانوں کا وجود یا کم از کم انکی باعزت زندگی گوارا نہیں لیکن ہندوؤں کی پوری قوم ایسی نہیں ہے، ان میں من حیث القوم انسانیت اور رواداری ہے، اور اخلاق کی قوت تو ایسی ہے کہ دشمنوں کے دل بھی مسخر کر لیتی ہے، اسلیے اگر مسلمان اسلامی اخلاق کا صحیح نمونہ پیش کریں تو ناممکن ہے کہ فرقہ پرست ہندو بھی اس سے متاثر نہ ہوں، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی اس کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی روشنی پھیل سکتی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان حکمران تو مفت میں بدنام ہیں، ان کو اپنی سیاست اور حکومت کی بقاء و استحکام کی فکر اور اپنے تعیشات سے اتنی فرصت اور اسکی توفیق کہاں تھی کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرتے، اگر انھوں نے اسکی جانب تھوڑی سی بھی توجہ کی ہوتی اور اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کی دلجوئی کی جتنی کوشش کی اگر اسکی عشر عشیر کوشش بھی ادنی طبقہ کی دلجوئی کیلیے کی ہوتی یا اینٹ اور پتھر کا تاج محل اور لال قلعہ بنانے کے بجائے اسلام کا اخلاق محل اور صبر قلعہ بنایا ہوتا تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یہ مانا کہ تاج محل مسلمانوں کی عظمت کا بہت بڑا نشان ہے لیکن اخلاق کا تاج محل اس سے زیادہ پائیدار نشان ہوتا۔

مذہب کی تبلیغ اور جبر متضاد چیزیں ہیں، کوئی مذہب بھی جبر و قوت سے نہیں پھیلایا جا سکتا اور اسلام کے متعلق تو اسکا تصور ہی غلط ہے، اسلام صرف زبان سے اقرار کا نہیں بلکہ دل و جان سے یقین کا نام ہے، اور جبر و قوت سے دل میں یقین نہیں پیدا کیا جا سکتا، اسلیے وہ اسلام ہی نہیں جو جبر سے قبول کیا جائے، اسلیے جو لوگ تلوار سے اسلام پھیلانے کا دعوی کرتے ہیں وہ نہ صرف اسلام بلکہ مذہب کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اگر مسلمان ہندوستان میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے حقوق کے حصول کی جد و جہد کیساتھ اسلامی تعلیمات اور اسلامی اخلاق کا ایسا نمونہ پیش کرنا چاہیے کہ ہندو نہ صرف انکے حقوق بلکہ انکا صحیح مقام دینے کیلئے مجبور ہو جائیں، یہ محض حصول مقصد کی تدبیر نہیں بلکہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ بھی ہے، آج ہندوستان میں اسلام کو صحیح شکل میں پیش کرنے کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جتنی پہلے تھی، پہلے وہ حکومت کے سہارے بھی قائم رہ سکتا تھا، مگر اب تو اس کو صرف اپنی خوبیوں کے بل پر قائم رہنا ہے۔

مسلمانوں کے صاحب اقتدار اور حکمراں طبقہ نے اپنی قوت اور برتری کے گھمنڈ میں اسلام کی تبلیغ کیا اسکو صحیح شکل میں پیش کرنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی، اگر علمائے حق اور صوفیائے کرام کا طبقہ نہ ہوتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد برائے نام ہی ہوتی، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ آج بہت سے تعلیمیافتہ ہندو تک اسلام سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اور انکو اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں ہیں، اس لیے اسلام کو صحیح شکل میں پیش کرنا اور اسکو مختلف طبقوں تک پہنچانا مسلمانوں کا فرض ہے، اسلام کو ہندوستان میں نہ صرف قائم رہنا ہے، بلکہ جس طرح اسکی اصلاح و ترقی میں پہلے اسکا اس کا نمایاں حصہ رہا ہے، اسی طرح آیندہ بھی یہ فرض انجام دینا ہے، اور یہ مسرت کا مقام ہے کہ بعض جماعتیں خصوصاً مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت اس فرض کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے، اور اس کار خیر میں اعانت ہر مسلمان کا فرض ہے۔

مقالات

الفریڈ گلیوم کے ورثۂ اسلام پر ایک نظر

۲- اعتزال کا زوال اور سنت کا احیا

از

جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے، بی ٹی ایچ، رجسٹرار امتحانات عربی فارسی اتر پردیش

(۴)

ذہنی انتشار اور ارتیابیت پروفیسر موصوف نے لکھا ہے:

"لوگوں کے ذہن پراگندہ ہو چکے تھے۔"

مگر انھوں نے اس ذہنی انتشار کے وجوہ و اسباب نہیں بتائے، نیز انھوں نے اس واقعہ سے جو نتیجہ نکالا ہے کہ

"اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ مروجہ فلسفہ کی روشنی میں دینی عقائد کی پھر سے تفسیر کی جائے۔"

یقیناً غلط ہے۔ اسکی تفصیل تو آگے آ رہی ہے۔ سردست ہمیں اس پراگندہ ذہنی کے وجوہ و اسباب کو تلاش کرنا ہے، اس فکری انتشار کا اصل سبب "عقلیت مفرط" تھی، اور یہ ایسا گھن ہے کہ جس سماج کو لگا اسے کھوکھلا ہی کر کے چھوڑا، چنانچہ یونانی فلسفے کے قبل سقراطی دور میں طبیعیین قدیم

کی "تحکیمیت" کا نتیجہ بالآخر سوفسطائیہ کی تشکیک کی شکل میں نمودار ہوا، یونانی فلسفے کے دوسرے دور میں وہ "عقلیت" جو افلاطون و ارسطو کے فلسفہ کا مایۂ ناز تھی، پرہو اور اقادیمیا کی ارتیابیت کا باعث بنی، کارنیاڈیز کی تعلیم اکاڈیمی کی تشکیک کی انتہائی منزل ہے۔[1] اسی طرح جب یورپ کے اندر سترہویں صدی میں عقلیت اور تجربیت کی نزاع کی شکل میں قدیم تحکیمیت کو دوبارہ زندہ کیا گیا، تو اس کا انجام ہیوم اور کانٹ کی لاادریت میں نمودار ہوا، پچھلی صدی میں جب "ایجابیین" نے پھر اسی قدیم تحکیمیت کو باندازِ دگر پیش کیا تو ہرچند اس وقت وہ اپنی جدت سے مطمئن ہوں، لیکن آج ان کی تجربیت اور محسوس پرستی کا شجر ملعون اپنی سنت قدیم کے مطابق تشکیک و ارتیابیت اور حیرانی و سرگشتگی کا ثمر تلخ لا رہا ہے۔

ادعائیت و تحکیمیت کا انجام ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ عقلیت مفرط کی انتہا تشکیک و ارتیابیت کی ابتدا ہے۔ اور یہی کیفیت تیسری صدی کے خاتمہ پر اسلامی سماج کی تھی، مسلم ثقافت مختلف فرقوں کے فکری تصادم کا نام تھی اور کوئی فرقہ ایسا نہ تھا جو فکری طور پر بے مایہ ہو یا جس کے موقف کی تائید و نصرت کے لیے مفکرین و اہل علم کی کمی ہو، ابن الندیم نے "کتاب الفہرست" کے پانچویں مقالے میں اساطین متکلمین کی مساعی کلامیہ کا ذکر کیا ہے، ان میں شیعی متکلمین بھی تھے، جیسے ہشام ابن الحکم، شیطان الطاق، ابوسہیل نوبختی، حسن بن موسیٰ نجتی، ہشام الجوالیقی وغیرہ اور خارجی متکلمین بھی تھے، جیسے یمان بن رَباب، یحییٰ بن کامل، صیرفی وغیرہ۔ اسی طرح معتزلی متکلمین بھی تھے جو عقیدۂ قدر کے قائل اور صفات باری کے منکر تھے، جیسے ابوالہذیل العلاف، ابراہیم بن سیار النظام، بشر بن المعتمر، ابوموسیٰ مزدار، ثمامہ بن اشرس، ہشام بن عمرو الفوطی، ابویعقوب الشحام، ابوجعفر اسکافی، جعفر بن مبشر، جعفر بن حرب، جاحظ، ابوالحسین الخیاط، ابوالقاسم الکعبی، ابوعلی الجبائی،

[1] مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص ۲۲۴

ابوالعباس الناشی، ابوہاشم الجبائی وغیرہم۔ ان کے مقابلے میں عقیدۂ جبر کے علمبردار تھے، جیسے حسین بن محمد النجار، حفص القرد، ضرار بن عمرو، محمد بن عطیۃ العطوی، ابومنذر سلام القاری وغیرہم، اسی طرح معتزلہ کی نفی صفات کے مقابلے میں فرقہ مشبہ تھا، جس کا سب سے بڑا علمبردار محمد بن کرام تھا، یہ فرقہ حسب تصریح شہرستانی بارہ فرقوں میں منقسم تھا، پھر معتزلہ کی "تعطیل" اور "قدر" کے مقابلے میں اہل سنت والجماعت تھے، جن کے بڑے ترجمان عبداللہ بن محمد بن کلاب القطان، ابوالعباس القلانسی، حارث بن اسد المحاسبی، عبدالعزیز بن یحییٰ المکی تھے، ان کے علاوہ مرجئہ کے مختلف طبقے تھے، جنکے بڑے مفکرین یونس النمیری، عبید المکتب، غسان کوفی، ابوثوبان، بشر بن غیاث المریسی، ابی معاذ التومنی، صالح ابن عمرو الصالحی، محمد بن شبیب، ابوشمر وغیرہم تھے، غرض پورا اسلامی معاشرہ مناظرے کا دنگل بنا ہوا تھا، اور کوئی مناظر دوسرے سے دبنے والا نہ تھا، نہ کسی کا اسلحہ خانہ دلائل کے ہتھیاروں سے خالی ہوا جاتا تھا، ہر مسئلے کے اندر موافق اور مخالف دلائل برابر کی قوت کے ساتھ ٹکراتے تھے، ظاہر ہے اس "تکافؤ ادلہ" میں حق جویاں کے لیے سرگشتگی و حیرانی کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا، روح عصر تشکیک و ارتیابیت کی گرفت میں پھنسی ہوئی تھی، خود امام ابوالحسن الاشعری عرصے تک اس ذہنی سرگشتگی میں مبتلا رہے، جیسا کہ انھوں نے اعتزال سے تائب ہوتے وقت جامع مسجد بصرہ میں فرمایا تھا،

انی نظرت فتکافأت عندی	میں نے غور کیا تو دیکھا کر (موافق و مخالف) دلائل
الادلۃ ولم تبرجح عندی	میری نظر میں برابر قوت رکھتے ہیں اور میرے نزدیک
حق علی الباطل ولا باطل علی حق[1]	نہ حق کو باطل پر ترجیح کی کوئی وجہ ہے اور نہ باطل کو حق پر

یہ اسباب تھے لوگوں کی ذہنی پراگندگی اور انتشار فکر کے اور ان کی اصل "عقلیت مفرطہ" تھی۔ جو نتیجہ تھی مروجہ فلسفہ میں توغل کا۔ غرض مروجہ فلسفہ "سبب مرض" تھا، اور کوئی معالج مرض کا علاج "از دیاد سبب" سے نہیں کیا کرتا، لہذا پروفیسر گل لیوم کا یہ خیال ناقابل تسلیم ہے کہ "اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ مروجہ فلسفہ کی روشنی میں دینی عقائد

[1] تبیین کذب المفتری ص ۳۹

کی پھر سے تفسیر کی جائے۔"

اس بات کی تحقیق کے لیے ہمیں پھر انسانی فکر کی تاریخ کے فیصلوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جب وہ تحکیت جو یونان قدیم کے طبیعین کا عام انداز تھی، سوفسطائیہ کی تشکیک پر ختم ہوئی، تو سقراط نے یونانی فکر کا رخ مابعد الطبیعی قیاس آرائیوں سے موڑ کر اخلاقیات کی جانب کر دیا، اور جب وہ عقلیت جو افلاطون وارسطو کے فلسفہ کا مایۂ ناز تھی پر مو اور اقاد یمیا کی ارتیابیت کا باعث بنی تو یونانی فکر نے بالآخر مذہب ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈنی چاہی جس کا نتیجہ یونانی یہودی فلسفہ، نوفیثا غورثیت اور نوفلاطونیت تھا۔ عہد حاضر میں جب عقلیت وتجربیت کی نزاع کے پردے میں تحکیت قدیمہ کا انجام ہیوم اور کانٹ کی لاادریت میں ہوا تو یورپی فکر کو جرمن تصوریت پسندوں ہیگل، فختے اور شیلنگ وغیرہ کی متصوفانہ تصوریت سے اپنی تشنگی کو بجھانا پڑا، اور آج بھی جب مغربی فکر شدت تنویر کے باوجود ظلمت کدۂ اوہام بنی ہوئی ہے، وہ اپنی نجات کے لیے مذہبی عرفانیات کی جویا ہے۔

اسی طریقہ نے تیسری صدی کے سرے پر بھی جبکہ اسلامی سماج "تکافوٴ ادلہ" کی وجہ سے ذہنی سرگشتگی اور ارتیاب وتشکیک کی کشمکش سے دوچار تھا، وہ غیر شعوری طور پر اسی بر، الساعۃ (Pnacia) کا جویا تھا جس نے ہمیشہ انسانی فکر کو ایسے ذہنی اضطراب کے عالم میں سکون وطمانیت بخشا ہے۔ اسی روحانی سکون کی تلاش میں روح عصر امام ابوالحسن الاشعری کی دعاؤں کی شکل میں متمثل ہوگئی، چنانچہ انھوں نے تائب ہوتے وقت اپنی ذہنی سرگشتگی کے ذکر کے بعد فرمایا تھا:

فاستھدیت اللہ تبارک وتعالیٰ	پس میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے حصول ہدایت
نھدانی الی اعتقاد ما اودعتہ	کی دعا کی تو اس نے مجھے ان اعتقادات کی طرف

فی کتبی ھذہ[1]	ہدایت فرمائی جنھیں میں نے اپنی ان کتابوں میں قلمبند کیا ہے

اسلامی عقائد کی تشکیل جدید

پروفیسر گل لیوم نے اسلامی سماج کی ذہنی سرگشتگی کے ذکر کے بعد لکھا ہے:

"اور اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ مروجہ فلسفہ کی روشنی میں دینی عقائد کی پھر سے تفسیر کی جائے۔"

پروفیسر موصوف نے اس بات کی تفصیل نہیں بیان کی کہ یہ تفسیر جدید کس نہج پر کی گئی، صرف اجمالاً اتنا بتادیا کہ عملی طور پر اس "تفسیر جدید" کے فریضہ کو امام ابوالحسن الاشعری اور ابومنصور الماتریدی نے انجام دیا، اس پر تبصرہ تو آگے آرہا ہے، لیکن کم از کم اتنا تو خود فاضل پروفیسر کو بھی اعتراف ہے کہ اس تفسیر جدید کی ضرورت اسی نہج پر محسوس کی جارہی تھی جس پر بعد میں امام اشعری اور امام ابومنصور ماتریدی نے اسے انجام دیا، دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے مروجہ فلسفہ کی روشنی میں یہ کام کیا یا اس سے بغاوت فرماکر۔

خوش قسمتی سے امام اشعری کے انقلاب فکر کی تفصیل تاریخ میں محفوظ ہے، اور یہ ایسے بزرگوں کی روایات پر مبنی ہیں جو ان واقعات کے عینی شاہد تھے، یا جنھوں نے ان کے عینی شاہدوں سے سنا تھا، ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں ان روایات کو بڑی شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ان الشیخ ابا الحسن لما تبحر	جب امام ابوالحسن الاشعری نے علم کلام میں
فی کلام الاعتزال وبلغ غایۃ	تبحر حاصل کر لیا اور اس درجہ کو پہنچے کہ وہ درس
کان یورد الاسئلۃ علی	میں استادوں پر سوالات وارد کرتے تھے اور جب
استاذیہ فی الدرس ولا یجد فیھا	اس کا شافی جواب نہ ملتا تھا تو اس سے

---

[1] تبیین کذب المفتری ص ۳۹

جوابماشافیا فحیرنی ذلک[1] گرداب حیرت میں پھنس گئے۔

ان سوالات وجوابات کی تفصیل عقائد وکلام کی کتابوں میں مذکور ہے، ان میں سب سے مشہور "برادران ثلاثہ کا قصہ" ہے، جو معتزلہ کے "وجوب اصلح" کے عقیدہ پر ایک کاری ضرب ہے بقول ابن خلکان اس سے عاجز ہوکر ابو علی جبائی نے کہا تھا "انہ مجنون"[2] جس پر امام اشعری نے برجستہ فرمایا: "لا بل وقف حمار الشیخ فی العقبۃ"[3]۔

بہر حال اس حیرت وسرگشتگی کے بعد حقیقت کی تلاش فطری تھی اور تاریخ کے عام قانون کے مطابق "کج فہمی عقل" کی تصحیح انھوں نے "الہام ربانی" سے کرنا چاہی جو مسلمانوں میں "اعتصام بالسنۃ" کے نام سے مشہور ہے، مگر بتکدۂ ذہن میں جو بدعات کے اصنام تراش رکھے تھے، انھیں اپنے ہی ہاتھوں توڑتے ہوئے ہچکچاتے تھے، اس ذہنی کشمکش نے اس مشہور خواب کی شکل اختیار کرلی، جسے بالعموم ان کے سبھی سوانح نویسوں نے نقل کیا ہے، اسکا ماحصل یہ ہے:

"تیسری صدی ہجری کے آخر میں ایک (غالباً ۲۹۶ھ) رمضان کا واقعہ ہے کہ امام اشعری نے عشرۂ اول میں ایک رات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی حضورؐ نے فرمایا اے علی! (امام اشعری کا نام ہے) اس مذہب کی نصرت وحمایت کرو جو مجھ سے روایت کیا گیا ہے، کیونکہ وہی حق ہے، امام صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں بیدار ہوا تو مجھے اضطراب عظیم لاحق ہوا اور میں برابر متفکر ومغموم رہا کیونکہ میرے نزدیک مذہب مرویہ کے خلاف واضح دلائل موجود تھے، یہانتک کہ دوسرا عشرہ آگیا اور میں نے پھر خواب میں حضورؐ کو دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں "جس بات کا میں نے تمھیں حکم دیا تھا اسکے سلسلے میں تم نے کیا کیا؟" میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ آپ سے جو مذاہب مروی ہیں لوگوں نے ان کی ایسی تاویلات کی ہیں جن میں بہت کچھ قیل وقال کی گنجایش ہے، لہذا میں نے صرف ان ہی توجیہات (تنزیہہ نا تعطیل) کی پیروی کی ہے، جن کا اطلاق باری تعالیٰ پر درست ہے۔

۱؎ تبیین کذب المفتری ص ۳۰ ۲؎ ابن خلکان جلد اول ص ۴۱۴ [تو تو پاگل ہے] ۳؎ ایضاً ص ۴۸۱

حضور نے پھر فرمایا "نہیں اسی مذہب کی نصرت وحمایت کرو جو مجھ سے روایت کیا گیا ہے کیونکہ وہی حق ہے"۔ پس جب میں بیدار ہوا تو میں نے علم کلام کے ترک اور حدیث کی پیروی کا عزم راسخ کرلیا۔ یہانتک کہ ستائیسویں شب (لیلۃ القدر) آگئی اور ہم اہل بصرہ کی عادت تھی کہ قراء اور علماء و فضلاء جمع ہوکر اس شب میں ختم قرآن کیا کرتے تھے، میں بھی عادت مالوف کے مطابق ٹھہرا رہا۔ مگر تھوڑی دیر بعد نیند نے مجبور کردیا اور بادل ناخواستہ گھر جاکر سو رہا۔ خواب میں پھر حضورؐ کی زیارت ہوئی۔ آپ نے پوچھا "جس بات کا میں نے تمھیں حکم دیا تھا، اس سلسلے میں تم نے کیا کیا؟" میں نے عرض کیا، علم کلام کو ترک کردیا اور کتاب وسنت کو پکڑ لیا ہے۔ حضور نے ناراض ہوکر فرمایا تمھیں علم کلام کے چھوڑنے کو کس نے کہا تھا۔ میں نے تو تمھیں ان ہی مذاہب کی نصرت وحمایت کا حکم دیا تھا جو مجھ سے مروی ہیں، کیونکہ وہی حق ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اس مذہب کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں جو تیس سال سے میرے دل ودماغ میں رچا ہوا ہے اور جس کی ادلہ وبراہین کے استحکام میں میں نے اپنی عمر عزیز صرف کی ہے۔" حضورؐ نے فرمایا "مجھے معلوم ہے کہ اس سعی وکوشش میں اللہ تعالیٰ تمھاری مدد کریگا، لہذا اس میں سعی موفور بجالاؤ، کیونکہ وہی میرا مذہب ہے اور وہی وہ حق صریح ہے جسے لیکر میں مبعوث ہوا ہوں"۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور میں نے دل میں کہا، حق کے واضح ہوجانے کے بعد (اس سے بے توجہی گمراہی ہی گمراہی ہے۔ لہذا میں نے رویت باری اور شفاعت روز حشر وغیرہ کے سلسلے میں جو احادیث مروی تھیں ان کی نصرت وحمایت شروع کی۔ اس کوشش میں ایسے عجیب وغریب ابواب علم ومعرفت میرے اوپر کشادہ ہوتے تھے جنھیں نہ میں نے کسی مخالف سے سنا تھا اور نہ کسی کتاب میں پڑھا تھا، اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ یہ سب کچھ تائید غیبی ہے جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بشارت دی تھی۔"[1]

۱؎ تبیین کذب المفتری ص ۴۰-۴۱ اور ص ۴۲-۴۳

بہرحال اس ہدایت ربانی کے بعد انھوں نے اپنی سی سالہ کلامی تفکیر پر نظر ثانی فرمائی، عرصے تک وہ لوگوں سے غائب رہے اور ایک مبارک جمعہ کے دن لوگوں نے امام اشعری کو جامع مسجد کے منبر پر فرماتے ہوئے سنا:

معاشر الناس انی انما تغیبتُ	لوگو! میں اس مدت میں تم سے غائب رہا کیونکہ
عنکم فی هذه المدة رعنی نظرت	میں اس عرصے میں غور و فکر میں مشغول تھا، مگر ہر
فتکافأت عندی الادلة ولم	مسئلے میں دونوں جانبوں [اثبات و نفی] کی
یترجح عندی حق علی الباطل	دلیلیں مجھے برابر قوت کی معلوم ہوئیں، لہذا میرے
ولا باطل علی حق فاستهدیت	نزدیک نہ حق باطل پر راجح تھا، نہ باطل حق پر،
الله تبارک وتعالی فهدانی الی	پس میں نے اللہ تعالیٰ سے ہدایت فرمانے کی دعا کی،
اعتقاد ما اودعته فی کتبی هذه	اس نے مجھے ان اعتقادات کی طرف ہدایت
وانخلعت من جمیع ما کنت اعتقده کما انخلعت	فرمائی جنھیں میں نے اپنی کتابوں میں قلمبند کیا ہے۔
من ثوبی هذا وانخلع من ثوب کان علیه ورمی	ان کے علاوہ اور جو بھی میرے اعتقادات
به ورفع الکتب الی الناس فمنها کتاب	رہے ہوں میں ان سے اسی طرح دستبردار
اللمع وکتاب اظهر فیه عوار	ہوتا ہوں جس طرح اپنی اس چادر کو اتار پھینکتا
المعتزلة سماه بکتاب کشف	ہوں۔" یہ کہکر انھوں نے اپنی چادر اتار کر پھینک دی۔
الاسرار وهتک الاستار	اور لوگوں کو [محولہ بالا] کتابیں پڑھنے کو دیں۔
وغیرهما۔ فلما قرأ تلک الکتب	ان میں ایک تو کتاب اللمع تھی اور دوسری کشف الاسرار
اهل الحدیث والفقه من اهل	وہتک الاستار" جس میں انھوں نے معتزلہ کے
السنة والجماعة اخذوا بما فیها	نضائح بیان کیے تھے۔ جب اہل سنت کے

وانتحلوه واعتقدوا تقدمه	محدثین و فقہا نے ان کتابوں کو پڑھا تو انھیں
واتخذوه اماماً حتی نسب	اپنا لیا اور امام صاحب کے مذہب کے پیرو ہوگئے،
مذهبهم الیه[1]	ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا اور انھیں
	اپنا امام و پیشوا بنالیا، یہاں تک کہ اہل سنت
	کا مذہب ہی ان کی طرف منسوب ہوگیا۔

بہرحال اجتماعی فکر کے تقاضوں اور ضمیر کی آواز سے مجبور ہوکر امام اشعری نے بالآخر تفلسف و اعتزال کے ان اصنام خیالی کو توڑ ہی ڈالا جنھیں تیس سال سے وہ حرز جان بنائے ہوئے تھے، اس کے بعد انھوں نے کیا مسلک اختیار کیا اس کے متعلق خود فرماتے ہیں:

فاستیقظت وقلت ما بعد الحق	پس میں بیدار ہوا اور دل میں سوچا کہ حق
الا الضلال واخذت فی نصرة	(کے واضح ہو جانے) کے بعد (اس سے بے توجہی
الاحادیث فی الرویة والشفاعة	گمراہی ہی گمراہی ہے، لہذا میں نے ان احادیث
والنظر وغیر ذلک[2]	کی نصرت و حمایت شروع کی جو رویت باری
	اور شفاعت روز حشر کے باب میں مروی ہیں۔"

اوپر امام اشعری کا قول مذکور ہو چکا ہے کہ میں نے تائب ہونے کے بعد علمائے اہل سنت کے سامنے کتاب اللمع اور کشف الاسرار و ہتک الاستار وغیرہ کتابیں پیش کیں جن کی انھوں نے تصویب کی تھی، ان میں سے کتاب اللمع کو جوزف میکارتھی نے شائع کر دیا ہے، اس کے "الباب الثانی باب الکلام فی القرآن والارادة" میں فرماتے ہیں:

ان قال قائل لم قلتم ان الله تعالیٰ	اگر کوئی یہ کہے کہ تم اس بات کے قائل کیوں ہو کہ

---

[1] تبیین کذب المفتری ص ۳۹۔ ۴۰ [2] ایضاً ص ۴۱

لم یزل متکلماً و ان کلام اللہ تعالیٰ غیر مخلوق قیل لہ ....[1]	اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے تو اس سوال کے جواب میں اس سے کہا جائے گا ....

ظاہر ہے رویت باری تعالیٰ، شفاعت روز حشر اور قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے عقیدے فقہاء و محدثین اہل سنت ہی کے ساتھ مخصوص تھے، اور معتزلہ ان کے سختی کے ساتھ منکر تھے، غرض ذہنی پراگندگی و فکری انتشار کے بعد اسلامی عقائد کی تفسیر جدید مروجہ فلسفہ اور اعتزال سے بغاوت کرکے کی گئی اور اجتماعی فکر معتزلہ کے اٹھائے ہوئے سوالات کے ساتھ رعایت کرنے کے بجائے ان کے کلامی نظام کے ترک و رفض پر مجبور رہوئی، (اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے) اس کے ساتھ وہ پھر سے سلف صالحین کے اعتقادی نظام کی جانب رجوع کرنے کے لیے بیتاب تھی، جیسا کہ خواب میں امام ابو الحسن الاشعریؒ نے لسان وحی و رسالتؐ سے سنا:

صنف وانظر هذه الطريقة	تصنیف تالیف کے کام کو جاری رکھو اور
التی امرتك بها فانها دینی	جس مسلک کا میں نے تمھیں حکم دیا ہے اس پر
وهو الحق الذی جئت به[2]	غور کرو کیونکہ وہی میرا دین ہے جسے لیکر میں مبعوث ہوا

لیکن پروفیسر گل لیوم کا اصرار ہے کہ چوتھی صدی میں اسلامی سماج نے معتزلہ کے فکری نظام کو جزوی ترمیمات کے ساتھ اختیار کر لیا، اور اپنے اعتقادی نظام کی تفسیر جدید مروجہ فلسفہ کی روشنی میں کی۔ فیا للعجب

نئے کلامی فلسفہ کے بانی

پروفیسر گل لیوم نے تحریر فرمایا ہے:

"اس کام کو [رائج الوقت فلسفہ کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تفسیر جدید کو] دو عالموں

---

[1] کتاب اللمع ص ۱۵ [2] تبیین کذب المفتری ص ۴۳، دوسری روایت میں ہے "انما امرتك بنصرة المذاهب المرویة عنی فانها الحق۔"

نے اپنے ہاتھ میں لیا اور یہی علماء مسلمانوں کے کلامی فلسفے یعنی علم کلام کے بانی ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ابو الحسن الاشعری البغدادی (۹۳۲ء) اور دوسرے ابو منصور الماتریدی (۹۴۴ء) ہیں۔"

لیکن مذکورۃ الصدر تصریحات کے بعد فاضل پروفیسر کا یہ کہنا غلط ہے کہ

"امام ابو الحسن الاشعری اور امام ابو منصور الماتریدی نے رائج الوقت فلسفہ کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تفسیر جدید کی۔"

امام اشعری کی اعتزال بیزاری کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی۔ اعتزال سے تائب ہونے کے بعد انھوں نے معتزلہ اور ان کے کلامی نظام کے رد میں بکثرت کتابیں لکھیں، مثلاً کتاب فی خلق الاعمال [نقض فیہ اعتلالات المعتزلہ والقدریہ] کتاب فی الاستطاعۃ علی المعتزلہ، کتاب کبیر فی الصفات [علی اصناف المعتزلۃ والجهمیہ ورؤسائهم] کتاب فی جواز رویۃ اللہ بالابصار، کتاب نقض فیہ الکتاب المعروف بالاصول علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی، نقض تاویل الادلۃ علی البلخی، نقض کتاب للخالدی فی القرآن والصفات، القاہر لکتاب الخالدی فی الارادہ، نقض کتاب للخالدی (نفی فیہ رویۃ اللہ تعالیٰ بالابصار) نقض کتاب للخالدی (نفی فیہ خلق الاعمال)، المختصر فی التوحید والقدر، نقض الکتاب المعروف باللطیف علی الاسکافی، نقض کلام عباد بن سلیمان فی دقائق الکلام، نقض کتاب علی بن عیسیٰ، تفسیر القرآن [رد فیہ علی الجبائی والبلخی] کتاب فی الرویۃ [نقض بہ اعتراضات اعترض بہا علیہ الجبائی] نقض المضاہاۃ [علی الاسکافی فی التسمیۃ بالقدر]، کتاب العمد فی الرویۃ، کتاب فی معلومات اللہ و مقدوراتہ [علی ابی الہذیل] کتاب فی الصفات [علی حارث الوراق] کتاب فی الرد فی الحرکات [علی ابی الہذیل]۔ اپنے زمانۂ اعتزال کی تصانیف کا بھی رد لکھا، مثلاً کتاب الجوابات فی الصفات عن مسائل اہل الزیغ والشبہات، اور زمانۂ اعتزال کی کتاب فی

باب شیٔ وان الاشیاء ہی اشیاء وان عدمت کا نقض۔[1]

اسی طرح فلاسفہ کے رد میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں، یہانتک کہ رائج الوقت فلسفہ [ارسطاطالیسی فلسفہ] کی تردید میں بھی مثلاً "کتاب فی الرد علی الفلاسفہ [نقض فیہ علل ارسطو طالیس فی السماء والعالم]، کتاب آثار العلویہ علی ارسطو طالیس وغیرہ۔[2]

امام ابو منصور الماتریدی کے یہاں امام اشعری کا سا فکری انقلاب نہیں ملتا، مگر وہ بھی اپنے اسلاف و اساتذہ کی طرح شروع سے آخر تک معتزلہ کے مخالف رہے۔ اوران کے رد میں متعدد کتابیں لکھیں، مثلاً بیان اوہام المعتزلہ، نقض تاویل الادلۃ للبلخی وغیرہ۔[3] ممکن ہے فلاسفہ کے رد میں بھی کتابیں لکھی ہوں،

اس لیے ان دونوں بزرگوں پر یہ محض بہتان وافترا ہے کہ انھوں نے معتزلہ کے اٹھائے ہوئے سوالات کے ساتھ کوئی رعایت کی یا مروجہ فلسفہ کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تفسیر جدید کی۔

اسی طرح پروفیسر گل لیوم کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ

(۳) امام ابوالحسن الاشعری اور امام ابو منصور الماتریدی مسلمانوں کے کلامی فلسفے یا علم کلام کے بانی تھے۔

علم کلام کے آغاز وارتقا کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے، علم کلام کا آغاز اصحاب حضرت علیؓ کے حلقہ میں ہوا، اور اس کے قدیم ترین نمایندے معتزلہ تھے جن میں سب سے زیادہ واصل بن عطاء الغزال کا نام مشہور ہے۔ علم کلام کو علم کلام کے نام سے جہم بن صفوان نے شروع کیا، عباسی خلافت میں تیسری صدی کے خاتمہ تک علم کلام فرق مبتدعہ کے ساتھ مخصوص تھا، اہل سنت اس کے نام تک سے بیزار تھے۔ امام اشعری اور امام ابو منصور ماتریدی سے بہت پہلے معتزلی نیز دیگر فرقوں

[1] تبیین کذب المفتری ص ۱۲۹-۱۳۵ [2] ایضاً ص ۱۳۴-۱۳۶ [3] الجواہر المضیئہ جلد ثانی ص ۱۳۰

کے متکلمین نے اس مخصوص نظام فکر کو مکمل کر دیا تھا، لہذا یہ "دونوں عالم" کسی طرح مسلمانوں کے کلامی فلسفے یا علم کلام کے بانی قرار نہیں دیے جا سکتے۔

اسی طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ یہ "دونوں عالم" اہل سنت کے اعتقادی نظام کے بانی تھے، اہل سنت کے اعتقادی نظام کی بنا قرآن نے ڈالی تھی، اس کی تفسیر سنت رسول نے فرمائی اور کتابی شکل میں اسے فقہاء و محدثین نے مرتب فرمایا، ان میں قدیم ترین تصنیف جو اب تک دریافت ہو سکی ہے، امام ابو حنیفہؒ کی "الفقہ الاکبر" ہے، جس کی امام ابو منصور الماتریدی نے شرح لکھی،[1] اور جسے بعد کے احناف نے اعتقادیات کے باب میں اپنی تفکیری سرگرمیوں کا سنگ بنیاد بنا دیا،

امام ابو منصور الماتریدی امام ابو نصر العیاضی کے شاگرد تھے، اور شاگرد و استاد دونوں نے امام ابو بکر الجوزجانی سے، انھوں نے امام ابو سلیمان الجوزجانی سے، انھوں نے امام محمد بن حسن الشیبانی سے اور امام محمد نے امام ابو حنیفہؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی،[2] امام ابو منصور الماتریدی نے اپنے اساتذہ نیز دیگر اساطین علمائے حنفیہ کے اعتقادی فتاوی سے سرمو تجاوز نہیں فرمایا، لہذا ان قدمائے احناف کے مقابلے میں امام ابو منصور الماتریدی کو حنفیوں کے کلامی فلسفہ کا بانی نہیں سمجھا جا سکتا،

اسی طرح امام اشعری کو اہل سنت کے کلامی فلسفہ کا بانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ "تبیین کذب المفتری" کی تصریح اوپر مذکور ہوئی کہ

فلما قرء تلک الکتب اھل الحدیث	جب اہل سنت کے محدثین و فقہا نے ان کتابوں
والفقہ من اھل السنۃ والجماعۃ	کو پڑھا تو انھیں اپنا لیا اور امام صاحب کے مذہب
اخذوا بما فیھا وانتحلوہ واعتقدوا	پیرو ہو گئے، انکے فضل و کمال کا اعتراف کیا

[1] اس شرح کو دائرۃ المعارف حیدرآباد نے ۱۳۶۵ھ میں شائع کر دیا ہے [2] الجواہر المضیئہ جلد ثانی ص ۱۳۰

تقدامه واتخذوه اماما حتی	اور انھیں اپنا امام و پیشوا بنالیا، یہانتک کہ
نسب مذهبهما الیه"	اہل سنت کا مذہب ہی انکی طرف منسوب ہوگیا،

یعنی اتحاد مسلک کی بنا پر اہل سنت کا اعتقادی نظام امام ابوالحسن الاشعری کے نام سے منسوب ہوا، ورنہ وہ اس کے بانی نہیں ہیں، خود امام اشعری کو اعتراف ہے کہ ان کا مذہب متقدمین اہل سنت ہی کا مذہب ہے۔ "کتاب الابانہ" میں فرماتے ہیں:

فان قال لنا قائل قد انکرتم	پس اگر کوئی ہم سے کہے کہ تم نے معتزلہ کے قول کا
قول المعتزلة ...... فعرفونا	تو انکار کیا...... اب ہمیں اپنا مسلک بتاؤ،
قولکم الذی به تقولون ودیانتکم	جسکے تم قائل ہو اور اپنا دین بتاؤ جس کے تم پابند ہو
التی تدینون قیل له قولنا	تو اسے کہا جائیگا کہ ہمارا وہ قول جس کے ہم قائل ہیں
الذی نقول به ودیانتنا التی	اور وہ دین جس کے ہم پابند ہیں، اپنے رب کی کتاب
ندین بها التمسك بكتاب	اور اپنے نبی کی سنت اور جو کچھ صحابہ و تابعین اور
ربنا عزوجل وبسنة نبینا علیه السلام	ائمہ حدیث سے مروی ہو، ان سب کا اعتصام ہے
وماروی عن الصحابة والتابعین	اور ہم اسے ہی مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں اور جس
وائمة الحدیث ونحن بذلك	بات کے امام احمد بن حنبل قائل ہیں ....
معتصمون وبما کان یقول به	اسی کے ہم قائل ہیں اور جو اقوال ان کے
ابوعبدالله احمد بن حنبل	قول کے مخالف ہیں ہم بھی ان اقوال
...... قائلون ولما خالف	کے مخالف ہیں۔
قوله مخالفون[1]	

[1] کتاب الابانہ: شائع کردہ دائرۃ المعارف حیدرآباد، ص ۵۰۔

سلف صالحین کی ہمنوائی امام اشعری کا محض زبانی قول ہی نہیں تھا، بلکہ دینی و فلسفیانہ مسائل میں وہ اسلاف ہی کے پیرو تھے، مثلاً وجود و ماہیت کی عینیت و غیریت کے مسئلہ میں وہ ائمۂ اہل سنت اور ائمۂ نظار، مثلاً ابی محمد کلاب اور ابی محمد بن کرام کے ساتھ متفق اللسان تھے [الرد علی المنطقیین کی تصریح اوپر مذکور ہوئی[1]] اسی طرح کلامی مسائل میں وہ سلف صالحین کے نقش قدم پر چلتے تھے، چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین اور ائمۂ اسلام مثلاً امام مالک، ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد، شافعی، احمد بن حنبل، ابو حنیفہ، ابو یوسف اور کلابیہ و کرامیہ کے ساتھ امام اشعری اور ان کے متبعین بھی اللہ تعالیٰ کی رویت بالابصار کو ثابت کرتے ہیں[2] مزید شواہد و مثالوں کا پیش کرنا موجب تطویل ہوگا،

بہرحال امام ابوالحسن الاشعری سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے، بالخصوص ابو محمد عبداللہ بن کلاب کے، چنانچہ انھوں نے اکثر اقوال جن کے مجموعہ کا نام "اشعریت" ہے، ابن کلاب ہی سے اخذ کیے تھے، گو وہ ان کے شاگرد نہیں تھے، اسی تاثر معنوی کی وجہ سے حافظ ابن تیمیہ نے ابن کلاب کو امام اشعری کا امام بتایا ہے۔ "وهذا قول ابن کلاب امام الاشعری[3]"

لہٰذا علی الاقل اس کلامی فلسفہ کی بنیاد جو بعد میں "اشعریت" کہلایا، امام اشعری نے نہیں ڈالی بلکہ ان سے قبل ابو محمد عبداللہ ابن کلاب ڈال چکے تھے،

لیکن یہ محض اللہ تعالیٰ کی دین ہے کہ احناف کا اعتقادی نظام امام ابو منصور الماتریدی کے نام سے اور شوافع کا امام اشعری کے نام سے مشہور ہوا، مگر پروفیسر گل لیوم نے اصل حقیقت کو دریافت کرنے کے بجائے مشہور عوام اصطلاحوں پر ایک مفروضہ تاریخ کی تعمیر کردی،

[1] الرد علی المنطقیین ص ۶۵ [2] منہاج السنۃ۔ جلد اول ص ۲۱۵-۲۱۶ [3] ایضاً ص ۱۸۱

چند ناسخ و منسوخ آیات

از جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مدراسی ندوی

(۳)

"کتاب اللہ" کی طرح لفظ "نزلت" یا اس کے ہم معنی لفظ کے مفہوم کی تحدید سے بھی آیات ناسخ و منسوخ کی بحث پیدا ہوگئی ہے، نزول کا مقصد محض آیات قرآن ہی کا نزول نہیں ہے، بلکہ وحی کی دوسری قسمیں بھی مراد ہو سکتی ہیں، مثلاً

فقال عمر لما نزلت اتيت	جب "الشیخ والشیخة الخ" کی آیت اتری
النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقلت	تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا
اكتبها فكانه كره ذلك	اس کو لکھ دیجئے، آپ نے ناپسند فرمایا،

اس روایت میں "نزلت" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے کوئی بات آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی، خواہ وہ قرآنی آیت کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ لوگ "نزلت" کے معنی صرف نزول قرآن کے مراد لیتے ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ جبرئیل قرآنی آیات کے علاوہ بھی کچھ احکام لایا کرتے تھے، مثلاً رجم کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دینا، حدیثِ احسان میں انسانی شکل میں آنا، شہدائے بیر معونہ کے واقعات بیان کرنا، معراج میں ان کی آمد وغیرہ جیسیوں مثالیں ہیں، یہ ظاہر ہے کہ عربی زبان میں ان سب موقعوں

پر ان کے آنے کو نزل اور ان کے لائے ہوئے احکام کو جو منجانب اللہ ہوا کرتے تھے "نزلت" ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کی مثال بھی لفظ "قراء" کی ہے، جس کے معنی مطلق پڑھنے کے ہیں خواہ کوئی کتاب پڑھیں یا قرآن مجید کی تلاوت کریں۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی تھی، حضرت جبرئیل آپ کو ہر بات عربی ہی میں بتاتے ہوں گے۔ قرآن مجید کی آیت سنقرئك فلا تنسى الا ما شاء اللہ کے مطابق ہر قسم کی وحی کے الفاظ خواہ وہ خفی ہو یا جلی، آپ کے سینے میں محفوظ ہو جایا کرتے تھے، اس لیے وحی خفی (جبرئیل کی بتائی ہوئی وہ باتیں جن کا آیات قرآن سے تعلق نہیں ہوتا تھا) کے نزول کو بھی عربی میں "نزلت" ہی سے تعبیر کیا جائے گا، اور ان احکام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام جو پڑھتے تھے، ان کو قرأ ہی کہا جائے گا۔

وحی جلی اور وحی خفی حکم کے اعتبار سے ایک ہی ہیں، لیکن دونوں کی کیفیت میں تھوڑا فرق ہے، اسی بنا پر دونوں کی اہمیت میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔

وحی دو طرح کی ہوتی تھی، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے:

احیاناً یاتینی مثل صلصلة	وحی کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے، یہ میرے
الجرس وھو اشد علی فینفصم	لیے بہت سخت ہوتی ہے اور میرے پسینہ
عنی وقد وعیت ما قال واحیانا	نکلنے لگتا ہے، اور وہ مجھے یاد ہو جاتی ہے،
یتمثل الملك رجلاً فیکلمنی فاعی	کبھی فرشتہ انسان کی شکل میں آتا ہے اور باتیں
ما یقول (مقدمہ ابن خلدون ص ۵۷)	کرتا ہے، اسکی باتیں یاد کر لیتا ہوں۔

پہلی صورت میں جبرئیل کا نزول آپ کے ادراکِ بشری پر ہوتا تھا اور اس کی قوت سمع اور قوتِ بصر کو وحی کا ادراک ہونے لگتا تھا، اور فرشتہ جو کچھ کہتا تھا، وہ خود بخود یاد ہو جاتا تھا،

اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماضی کے صیغہ میں فرمایا "وقد وعیت ما قال" یعنی وہ جو کچھ کہتا تھا وہ مجھے یاد ہو جاتا تھا"، اور دوسری قسم کی وحی مکالمہ کی صورت میں ہوتی تھی، اس کو حضورؐ کوشش کر کے یاد فرماتے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے صیغہ حال "فاعی ما یقول" استعمال فرمایا یعنی میں اس کو یاد کر لیتا تھا، پہلی وحی قرآن مجید کے لیے خاص ہے جو "وحی جلی" کہلاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ
(قیامۃ)

جلدی یاد کرنے کے لیے زبان نہ ہلائیے، یہ ہمارا ذمہ ہے کہ اس کو (آپ کے سینے میں) جمع کر دیں، اور اس کی قرأت کرا دیں، جب ہم اس کی قرأت کریں تو آپ اس کی اتباع کیجئے، اس کے بعد اس کو بیان کر دینا ہمارا فرض ہے۔

دوسری وحی عام ہے جو قرآن اور غیر قرآن دونوں پر مشتمل ہے، اور قرآن بھی اس میں شامل ہو سکتا ہے، اس وحی میں فرشتہ جو کچھ کہتا ہے اس کو نبی خود یاد کرتا ہے، اور یہ اس کے اختیار کی چیز ہے، قرآن کی یہ آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے،

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى
اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (اعلیٰ)

ہم عنقریب آپ کو سنائیں گے، آپ نہیں بھولیں گے، مگر جو اللہ چاہے۔

پہلی قسم کی وحی کو جس میں صرف قرآن نازل ہوتا تھا، آپ فوراً کاتبوں کے ذریعہ لکھوا لیتے تھے، لیکن دوسری قسم کی وحی کو فوراً لکھنا ضروری نہیں تھا، اس قسم کی وحی میں قرآنی آیتیں بہت کم نازل ہوتی تھیں، اس لیے ان کے قلمبند کرانے میں جلدی کی ضرورت نہ تھی اور وہ بعد میں لکھوا لی جاتی تھیں، لیکن کبھی کبھی قرآن بھی اس وحی میں نازل ہوتا تھا جس کو لکھانے میں تاخیر ہو جاتی تھی، اس تاخیر سے

بعض لوگوں کو شبہہ ہو گیا کہ یہ وحی آیت قرآنی نہیں ہے، ورنہ آپ ضرور لکھوا دیتے، لیکن جب لکھوا دیا جاتا تو یہ شبہہ جاتا رہتا، اس کی بعض مثالیں حدیث میں بھی ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے:

ان ابن مسعود کان ینکر سورۃ
الفاتحۃ والمعوذتین من القرآن
(تبیان الجزائری ص ۹۶)

حضرت ابن مسعودؓ اس بات کے سرے منکر تھے کہ سورۂ فاتحہ اور معوذتین قرآنی سورتوں میں سے ہیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین قرآن میں لکھا ہے کہ ابن مسعودؓ نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ

انما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم
ان یتعوذ بھما

ان کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا۔

اس سے اس واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جس میں یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیدیا تھا، اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اللہ نے یہ دعائیں سکھائیں، چنانچہ اسی سے آپ اس کا علاج کرتے رہے، اسی طرح سورہ فاتحہ بطور دعا آپ کو سکھائی گئی، جس کو آپ نماز اور غیر نماز میں پڑھا کرتے تھے،

بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں حکم خداوندی سے ان سورتوں کو قرآن میں شامل کر لیا،

فہرست میں ابن ندیم بھی ایک روایت تبیان کی طرح نقل کرتے ہیں کہ

وکان عبد اللہ بن مسعود
لا یکتب المعوذتین فی مصحفہ
ولا فاتحۃ الکتاب

حضرت ابن مسعودؓ (شروع میں) نہ معوذتین کو اپنے صحیفہ میں لکھتے تھے، اور نہ سورۂ فاتحہ کو،

تبیان کی روایت میں بھی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ ان سورتوں کے قرآنی آیت ہونے

کے قائل نہیں تھے اور اس کو دعا یا علاج کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس لیے اس کو صحیفہ میں نہیں لکھا تھا، لیکن جب حضورؐ نے ان کو بھی قرآن کی سورتوں میں شامل کر لیا تو وہ بھی ان کے سورت ہونے کے قائل ہو گئے، اور اپنے صحیفہ میں لکھ لیا، چنانچہ فضل بن شاذ فرماتے ہیں:

وقد رأيت مصحفا قد كتب ۔۔۔ میں نے (ابن مسعودؓ) کا ایک صحیفہ دیکھا
منذ نحو مأتين سنة فيه ۔۔۔ جو دو سو سال قدیم تھا، اس میں سورۂ
فاتحة الكتاب (فہرست ابن ندیم) ۔۔۔ فاتحہ تھا،

پہلے ان کے صحیفہ میں تینوں سورتیں نہیں تھیں، اور بعد کے صحیفہ میں جب انھوں نے سورۂ فاتحہ کو شامل کر لیا تو معوذتین کا شامل کرنا بھی ضروری تھا، فضل بن شاذ نے غالباً صحیفہ کا پہلا حصہ دیکھا تھا اور آخر کا حصہ نہیں دیکھا تھا،

یہ آیتیں شروع میں وحی خفی کے ذریعہ معلوم ہوتی تھیں، اس کے بعد وحی جلی میں شامل کی گئیں، اس سے ان کے قرآنی سورۃ ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا، اس لیے کہ یہ بھی جبرئیل کے ذریعہ معلوم ہوا تھا، اگر کوئی فرق تھا تو وہ "وعیت" اور "اعی" یعنی حفظ کے طریقہ کا جس کی تفصیل اوپر گذر چکی،

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ بئر معونہ میں بہت سے صحابہ دھوکے سے شہید کر دیے گئے تو اس کی خبر حضرت جبرئیلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں دی

انهم لقوا ربهم فرضي عنهم ۔۔۔ وہ اپنے رب سے مل گئے، اللہ ان سے
وارضاهم (بخاری جلد ۱ ص ۲۹۳) ۔۔۔ راضی ہو گیا اور ان کو راضی کر دیا،

ان صحابہ نے شہادت کے وقت ایک دعا کی تھی، جس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں تھی، حضرت جبرئیلؑ نے یہ بھی خبر آ کر سنائی، اور اس دعا کی اطلاع ان الفاظ میں دی:

اللهم بلغ منا نبينا انا قد لقينا ۔۔۔ اے اللہ ہمارے نبی کو یہ خبر پہنچا دے کہ ہم اپنے
فرضينا عنك ورضيت عنا ۔۔۔ پروردگار سے مل گئے اور ہم آپ سے راضی تھے
(بخاری ج ۲ ص ۵۸۷) ۔۔۔ اور آپ بھی ہم سے راضی تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان شہداء نے ایسے خلوص و محبت اور عشق و وارفتگی کے جذبہ سے یہ دعا کی تھی کہ دوسرے عاشقان رسول نے بھی اس دعا کو اپنے لیے وظیفہ اور ورد بنا لیا تھا، اور ایک مدت تک اس کو قرآن کی طرح پڑھنے کا معمول رہا، ایک مدت بعد خود سے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو ترک کر دیا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

فقرأنا فيهم قرآنا ثم ان ذلك ۔۔۔ ہم نے اس دعا کو ان کی شان میں (یا یاد میں)
رفع (بخاری ج ۲ ص ۵۸۶) ۔۔۔ قرآن کی طرح ورد بنا لیا تھا پھر اسکو ترک کر دیا گیا،

اس روایت میں ترک کے لیے "رفع" استعمال کیا ہے، اور دوسری جگہ حضرت انسؓ ہی نے اسکو منسوخ سے تعبیر کیا ہے "ثم كان من المنسوخ" یعنی یہ حکم منسوخ ہو گیا،

مسٹر برق نے اس آیت کو توڑ مروڑ کر، عربی کی اصل عبارت حذف کر کے بڑی خیانت سے کام لیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: "حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ان لوگوں کے متعلق مندرجۂ ذیل آیت اتری تھی:

بلغوا قومنا انا قد لقينا ربنا فرضي ۔۔۔ ہماری قوم کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے پروردگار سے
عنا ورضينا عنه ۔۔۔ مل گئے، وہ ہم سے راضی ہو گیا اور ہم اس سے

اگر یہ آیت واقعی نازل ہوئی تھی تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کا باقی رہنا ضروری تھا، قرآن شریف میں غزوات اور اس قسم کے دیگر واقعات کے متعلق بیسیوں آیات نازل ہوئیں جو بعینہ محفوظ ہیں اور ان میں سے ایک حرف بھی منسوخ نہیں ہوا، اس آیت میں کیا خاص بات تھی کہ پہلے اتری اور پھر منسوخ کر دی گئی۔" (دو اسلام ص ۱۷۱)

اوپر کی تفصیل کی روشنی میں اس بیان کی حقیقت بالکل ظاہر ہو جاتی ہے،

تیسری چیز جس کی وجہ سے آیت ناسخ و منسوخ کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے وہ لفظ "الکتاب" ہے، کتاب اللہ کی طرح اسکے معنی بھی وسیع ہیں، اس کے صرف وہی معنی مراد نہیں ہیں جو فقہانے لیے ہیں، لوگوں نے عام طور پر یہ غلطی کی ہے کہ کتب احادیث کے مطالعہ کے وقت ہر جگہ کتاب اللہ "الکتاب" اور "منزلت" سے مراد قرآن ہی لیا ہے، اسی طرح جہاں "نسخ" یا "رفع" کا لفظ آیا ہے، اس سے آیات قرآنی کا نسخ سمجھ لیا جو صحیح نہیں ہے،

اس سلسلہ میں کتاب اور صحیفہ کے لفظوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے مراد کیا ہے، بہت سی احادیث میں کتاب اور صحیفہ کاپی (Note book) اور رکارڈ بک (Record book) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ عہد صحابہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سب کے پاس صحیفے ہوا کرتے تھے، خواہ اس کے اوراق کاغذ کے ہوں یا پتیوں کے یا ہڈیوں اور چمڑے کے۔ ان الفاظ سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ صحیفے یا اوراق محض ہڈی چمڑے یا پتیوں کا غیر مرتب انبار ہوتے تھے، بلکہ آجکل کی ڈفتی کی طرح یہ چیزیں مرتب ہوتی تھیں، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے تدوین قرآن میں اسکی پوری تفصیل لکھی ہے:

اس زمانہ میں ہوتا یہ تھا کہ صحابہ تمام قابل تحریر باتوں کو بغیر کسی منطقی ترتیب اور تقسیم کے ایک ہی صحیفہ یا کتاب میں لکھ لیا کرتے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں قرآن مجید کی جو آیتیں نازل ہوتی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ان آیات کی جو تفسیر و تشریح فرماتے تھے ان کو بھی اسی طرح لکھ لیتے تھے، احکام بیان کرتے تو ان کو بھی ضبط تحریر میں لے آتے تھے، ان سب کو الگ الگ اوراق یا علحدہ علحدہ ابواب میں نہیں لکھتے تھے، بلکہ سب کو بغیر کسی تمیز و تفریق کے ایک ہی جگہ لکھ لیتے تھے، کیونکہ اس دور کا طرز تصنیف ہی ایسا ہوتا تھا، اس کی بہترین مثال

شعراء جاہلی کا کلام ہے، عربی تہذیب و تمدن اور سیاست و معاشرت کے اظہار کا ذریعہ شاعری ہی تھا، نثر نگاری کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں تھا، اس لیے کہ نثر کا عروج تہذیب و تمدن کے شباب میں ہوتا ہے جیسا کہ دور عباسی میں ہوا، مثلاً ابن النسیب میں شاعر پہلے سوز و گداز کا اظہار کر رہا ہے کہ یکایک اس سلسلہ میں کوئی سفر یاد آگیا تو اس کا ذکر شروع کر دیگا، مثلاً اگر گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا تو گھوڑے کے اوصاف بیان کرے گا، اس لیے شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے الفوز الکبیر میں نظام آیات قرآن کو بھی اسی پر مبنی کیا ہے،

صحابہ کے ابتدائی دور میں بعض صحابہ کے پاس ایک صحیفہ یادداشت ہوتی جس میں وہ قرآن کے علاوہ اس کی تفسیر، احکام اور مسائل بھی لکھ لیتے تھے، لیکن چونکہ قرآن عام صحابہ کے حافظہ میں بھی محفوظ تھا، اور اس کی تلاوت کی جاتی تھی، اس لیے وہ یہ فرق آسانی سے کر لیتے تھے کہ ان میں کون حصہ قرآن کا ہے اور کون حصہ تفسیر کا، کون جزء آپ کے ارشاد پر مبنی ہے اور کون عہد نامہ پر مشتمل ہے، البتہ کاتبین وحی کے پاس جو آپ کی نگرانی میں قرآن لکھتے تھے، ان کے پاس خالص قرآن کے صحیفے اور مجموعے موجود تھے،

صحابہ کسی قرآنی آیت کو ایک صحیفہ سے دوسرے صحیفہ یا ایک سورت سے ہٹا کر دوسری سورت میں کر دیتے تو اس کو بھی نسخ کہا جاتا تھا، مثلاً بخاری کی ایک لمبی حدیث میں ہے:

فارسل عثمان الی حفصة	حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس ایک
ان ارسلی الینا الصحف ننسخها	آدمی بھیجا کہ وہ قرآن کا محفوظ نسخہ بھیجیں تاکہ
فی المصاحف ثم نردها الیك	اسکی نقل لیکر واپس کر دیا جائے۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ وعبد الرحمن بن	۔۔۔۔ اور عبد الرحمن بن حارث بن ہشام کو
الحارث ابن هشام فنسخوها	نقل کرنے کا حکم دیا، ان لوگوں نے کئی

فی المصاحف ...... اذا نسخوا	کاپیوں میں اس کو نقل کیا، نقلیں کرانے کے
الصحف فی المصاحف رد عثمان	بعد حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کو انکا
الصحف الی حفصة وارسل	نسخہ واپس کر دیا اور ان نقلوں کو ملک
الی کل افق بمصحف مما نسخوا	کے مختلف حصوں میں بھیجدیا

(تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۰۰)

اس حدیث میں "نسخ" نقل (Copy) کے معنی میں ہے، اس سے ہرگز منسوخ ہونا مراد نہیں، اس نسخ سے بھی منکرین حدیث کو دھوکا ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد اصطلاحی ناسخ و منسوخ ہے۔

مختلف چیزوں کو ایک ساتھ لکھنے کا طریقہ کچھ دنوں تک جاری رہا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے اس خطرہ سے منع فرمایا کہ مبادا اس سے کلام مجید اور دوسری چیزیں خلط ملط نہ ہو جائیں، چنانچہ حدیث میں ہے:

کنا نکتب ما سمعنا من النبی صلی اللہ	ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے
علیه وسلم فخرج علینا فقال ماذا	لکھ لیا کرتے تھے، ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم
تکتبون، فقلنا ما نسمع منك، فقال أكتاب	ہمارے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ کیا
مع كتاب الله امحضوا ..... كتاب الله	لکھ رہے ہو، ہم نے عرض کیا جو کچھ آپ کی زبان
واخلصوه قال فجمعنا ما كتبناه	سے سنتے ہیں، فرمایا کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور
فی صعید واحد ثم احرقناه	کتاب بھی لکھتے ہو، کتاب اللہ کو الگ کر دو اور مخصوص
....	کر دو (یعنی حدیث اور دوسری چیزیں اسکے ساتھ
(تدوین حدیث از مناظر احسن گیلانی ص ۲۴۹	نہ لکھو) اس حکم کے بعد ہم نے قرآن کے ساتھ جو اور چیزیں
بحوالہ مجمع الزوائد)	لکھی تھیں انہیں علیحدہ لکھ لیا اور اس مخلوط کتاب کو جلا دیا۔

اس حدیث میں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو دیا جو اس وقت آپ کی خدمت میں موجود تھے، سب صحابہ اس وقت نہ رہے ہوں گے، یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ کی ہر بات کو قلمبند کرنے والے بے شمار صحابہ تھے جو سب اس وقت موجود نہ رہے ہوں گے، اس لیے اس مخلوط مجموعے کے جلانے سے یہ شبہہ نہ ہو کہ سب صحابہ نے جلا ڈالا ہوگا، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جلانے کا حکم نہیں فرمایا تھا، بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ قرآن اور غیر قرآن دونوں الگ الگ کتاب میں لکھے جائیں تاکہ خلط ملط نہ ہو جائیں، جن لوگوں نے جلا دیا وہ انکا ذاتی فعل تھا، حضورؐ کا منشا ہرگز جلانے کا نہ تھا، مسٹر برق نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ دوسری چیزوں کے مٹا دینے کا حکم دیا تھا، اور وہ چیزیں جلا دی گئی تھیں، اس کے باوجود احادیث کا ایک انبار جمع ہو گیا،

قرآن مجید ایک یا چند آیتوں کی شکل میں نازل ہوتا تھا، سورتوں کی تشکیل اس وقت ہوتی تھی جب آیات کا کافی حصہ جمع ہو جاتا تھا، قرآن کی موجودہ آیاتی اور سورتی تقسیم شروع ہی میں نہیں تھی، اس کی ترتیب اس طرح ہوتی تھی کہ جب چند آیتیں نازل ہوتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ان کو فلاں جگہ اور فلاں آیت کے ساتھ ملا دیا جائے، جب پھر مزید آیتیں نازل ہوتیں تو فرماتے کہ فلاں آیت کو فلاں جگہ کر دیا جائے اور ان آیتوں کو دوسری آیتوں کے ساتھ ملا دیا جائے، اس طرح آیتوں کے کئی کئی مجموعے ہو جاتے تھے، اور ہر ایک مجموعہ ایک ایک سورت کہلاتا تھا، پھر ان کی ترتیب میں بھی رد و بدل ہوتا رہتا، مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ الفرقان اور سورۂ بنی اسرائیل جب مکمل نہیں ہوئی تھیں، بلکہ ان کا نام بھی نہیں رکھا گیا تھا، اس وقت اگر دس آیتیں نازل ہوتیں تو ان میں سے پانچ معنوی مناسبت سے بقرہ میں لکھ دیجاتیں اور بقرہ کی چند آیات ہٹا کر مثلاً "الفرقان" میں لیجاتیں اور باقی پانچ آیتوں

کو الفرقان کی آیات میں شامل کر دیا جاتا، جب مزید آیتیں نازل ہوتیں تو اسی طریقہ سے ردوبدل ہوتا رہتا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک قرآن کا نزول ختم نہیں ہوا، یہ ردوبدل حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی جلی یا وحی خفی یا خود اپنے اجتہاد سے کرتے تھے،

تیئس سال تک جو تغیرات ہوتے رہے، ان میں سے ہر ایک سال کو ایک میقات کہنا چاہیے، ہر میقات کی انتہا رمضان پر ہوتی تھی، حدیث میں آتا ہے کہ جبرئیل ہر رمضان میں سال بھر یعنی اس میقات کی آیتوں کو بالترتیب سناتے تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب کے مطابق ہوتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب منشائے الٰہی کے مطابق ہوتی تھی،

مذکورۂ بالا بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترتیب میں جو ردوبدل فرماتے تھے، اس کو بھی عربی میں نسخ کہا جائے گا، چنانچہ قرآن مجید کے صحیفوں میں اس معنی میں بھی ناسخ و منسوخ کا استعمال ہوا ہے، اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی،

قرآن مجید کی ترتیب کے اس ردوبدل کا سرسید احمد خاں نے بھی بیان کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> قرآن مجید کی آیتیں ایک وقت میں نازل نہیں ہوتی تھیں بلکہ کوئی آیت کسی سورت کے وقت میں اور کوئی آیت کسی وقت میں نازل ہوئی تھی، ایک سورت ابھی ختم ہونے نہیں پائی تھی کہ دوسری آیت نازل ہونی شروع ہوئی، اور ایسی چند آیتیں نازل ہوئیں جن کا مضمون ان سورتوں کی آیتوں سے جو پہلے نازل ہو چکی تھیں محض مختلف تھا، اور یہ سورت بھی نامکمل رہ کر ایک اور سورت نازل ہونی شروع ہو گئی اور اسی طرح سلسلہ جاری رہا، تمام آیتیں جس طرح نازل ہوئیں علیحدہ علیحدہ چمڑوں کے ٹکڑوں پر اور بے ترتیبی سے لکھی ہوئی رہیں، اگرچہ پیغمبر خدا نے تمام آیتوں اور سورتوں

> کی ترتیب لوگوں کو بتا دی تھی، ان سب کو اس کا علم نہیں ہوا تھا، اسی سبب سے آیتوں کو بترتیب پڑھنے میں اختلاف واقع ہوا بعض لوگوں نے بعض آیتوں کو ان آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جن سے وہ ٹھیک طور پر علاقہ نہیں رکھتی تھیں، (خطبات احمدیہ ص ۴۲۹)

مختلف صحابہ کے نسخے مختلف تھے، کسی کے پاس مکمل قرآن نہیں تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں حضرت عمرؓ کی کوشش سے قرآن مجید کو آخری ترتیب کے مطابق سرکاری طور پر جمع کر دیا گیا، اور حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں اس سرکاری نسخے کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں، اور یہ حکم جاری کر دیا کہ بقیہ میقاتی ترتیبوں کو ضائع کر دیا جائے اور صرف آخری ترتیب کو باقی رکھا جائے اور اسی کے مطابق پڑھا جائے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال جو ترتیب بدلتے رہتے تھے بعض صحابۂ کرام کو جو دور دراز کے شہروں میں رہا کرتے تھے، اسکی اطلاع نہ ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں، کتنے ایسے صحابہ ہیں کہ حضور پر ایمان لانے کے بعد کچھ دن آپ کی صحبت میں رہے اور نماز وغیرہ کے ضروری مسائل سیکھ کر اپنے اپنے مقام پر واپس چلے گئے یا کہیں بھیج دیے گئے، یہ لوگ اسی طریقہ سے نماز پڑھتے رہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی تھی، درمیان میں اس کے احکام میں جو جزوی تبدیلی ہوتی تھی، اس کی ان کو خبر نہ ہونے پاتی تھی، اس کی مثال کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ مدینہ آئے اور نماز میں شریک ہو گئے، اس وقت تک ان کو اس کی خبر نہ تھی کہ نماز میں بات کرنا حرام ہے، اس لیے انھوں نے کچھ بات کی، نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سمجھایا کہ نماز میں سلام و کلام صحیح نہیں، جب نماز تک کا یہ حال تھا تو قرآنی آیات میں ترمیم کی خبر نہ پہنچنا کوئی حیرت کی بات نہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض دور دراز کے لوگوں کو خلافت راشدہ ہی نہیں بلکہ حجاج بن یوسف کے زمانہ تک آخری ترتیب کی اطلاع نہیں تھی، ایک

حدیث میں ہے کہ

عن الاعمش قال سمعت الحجاج بن یوسف یقول وھو یخطب علی المنبر الفوا القرآن کما الفه جبرئیل السورة التی یذکر فیها البقرة والنساء والسورة التی یذکر فیها آل عمران فلقیت ابراھیم فاخبرته بقوله فسبه

اعمش فرماتے ہیں، میں نے حجاج بن یوسف کو منبر پر تقریر کرتے ہوئے سنا کہ لوگو! قرآن کو اسی طرح ترتیب دو جس طرح جبرئیل نے ترتیب دی تھی، وہ سورتیں جو بقرہ، نساء اور آل عمران کہلاتی ہیں، میں نے ابراہیم کو یہ بات سنائی تو انھوں نے حجاج کو برا بھلا کہا،

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ حجاج سورتوں کی ترتیب بدلنا چاہتا ہے، اور آل عمران کو نساء کے بعد کر دینا چاہتا ہے، حالانکہ یہ بات نہ تھی، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ مصحف عثمانی میں جو ترتیب ہے، دوسرے مصاحف کو بھی اسی کے مطابق مرتب کیا جائے اور پرانی میقاتی ترتیب ترک کر دی جائے، جو جبرئیل کی آخری بیان کردہ ترتیب کے خلاف ہے، اور جس کو حضرت عثمانؓ نے ضائع کر دینے کا حکم دیا تھا، چنانچہ اسی حدیث کی شرح میں امام نووی تحریر فرماتے ہیں:

قال القاضی وتقدیمه ھنا النساء علی آل عمران دلیل علی انه لم یرد الا نظم الآی لان الحجاج انما کان یتبع مصحف عثمان رضی اللہ عنه ولا یخالفه

قاضی نے کہا کہ حجاج کا النساء کو آل عمران پر مقدم کر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی مراد صرف نظم آیات تھی، اس لیے کہ حجاج مصحف عثمانی کا پیرو تھا، اس کا مخالف نہ تھا، حالانکہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے

والظاھر انه اراد ترتیب السور

سورتوں کی ترتیب مراد لی تھی۔

(شرح مسلم جلد اول ص ۴۱۹)

اس دوسری ترتیب (میقاتی ترتیب) کے نسخوں کی چند مثالیں ابن ندیم نے بھی لکھی ہیں، ایک جگہ نزول آیات کی مقدار بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اول ما نزل من القرآن علی النبی صلی اللہ علیه وسلم اقرء باسم ربك الذی خلق الی علم الانسان مالم یعلم۔ ثم نون والقلم ثم یایھا المزمل وآخرھا بطریق مکة الخ (فہرست ابن ندیم مطبوعہ مصر ص ۳۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ اقرء باسم ربك سے علم الانسان ما لم یعلم تک، پھر سورۂ نون و القلم نازل ہوئی، اس کے بعد یایھا المزمل کی ابتدائی آیتیں، اس کی بقیہ آیتیں سفر مکہ کے راستہ میں اتریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابن ندیم کو صرف سورۂ اقرء اور یا ایھا المزمل کی آیات کی نزول کی کمیت اور کیفیت معلوم تھی، جو اس نے بیان کر دی، دوسری سورتوں کے متعلق غالباً علم نہیں تھا، اور یہ ہے بھی نہایت مشکل چیز، ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نزول آیات کے بعد اس کی کچھ مقدار مختلف سورتوں کے لیے متعین فرما دیتے، اس کے بعد ان کے نزول کی مقدار جس قدر بڑھتی جاتی منشائے الٰہی کے مطابق اس کو اسی طرح مختلف سورتوں میں تقسیم فرماتے جاتے، اور آخری میقات کی ترتیب تک، ردو بدل کا یہ سلسلہ جاری رہا، اس ردو بدل کو بھی عربی لغت میں نسخ کہتے ہیں، اس لیے اس نسخ سے بہتوں کو غلط فہمی پیدا ہو گئی، حدیثوں میں آتا ہے کہ بعض صحابی نے قرآن کی آیتوں کو موجودہ ترتیب کے خلاف پڑھا تو لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ پہلے یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں، پھر منسوخ ہو گئیں، یا موجودہ آیتیں پھر نازل ہوئیں، حالانکہ اس سے مراد

صرف یہ ہے کہ ان صحابہ نے کسی ایسے میقات کے صحیفہ سے پڑھا ہوگا جو آخری میقات کے صحیفہ کے علاوہ تھا،

ابن ندیم نے ایسے صحابہ کی ایک طویل فہرست دی ہے، جنھوں نے قرآن کی مختلف میقاتوں کی ترتیب کو محفوظ کیا تھا، مثلاً علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہ، سعد بن عبید بن النعمان بن عمرو بن زید رضی اللہ عنہ، ابوالدرداء عویمر بن زید رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل اوس رضی اللہ عنہ، ابوزید ثابت ابن زید بن النعمان، ابی بن کعب بن قیس بن مالک بن امرء القیس، عبید بن معاویہ بن زید بن ثابت ابن ضحاک وغیرہ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی ترتیب یہ تھی:

البقرۃ، النساء، آل عمران، المص، الانعام، المائدہ، یونس، براءۃ، النحل، ہود، یوسف، بنی اسرائیل، الانبیاء، المومنون، الشعراء .... الخ

اور ابی بن کعبؓ کی یہ تھی:

فاتحۃ الکتاب، البقرۃ، النساء، آل عمران، الانعام، الاعراف، المائدہ الذی التبسہ وہی یونس، الانفال، التوبہ، ہود، مریم، الشعراء .... الخ (فہرست ابن ندیم ص ۴۶)

ان دو مثالوں سے مختلف میقاتی ترتیب کا اندازہ ہوگیا ہوگا، اسی پر بقیہ میقاتوں کی ترتیبوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے،

مذکورہ عبارت میں ابن ندیم کے اس قول سے کہ "المائدۃ الذی التبسہ وھی یونس" یعنی مائدہ میں ابی بن کعبؓ کو التباس ہوگیا تھا جو درحقیقت سورۂ یونس تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ابی بن کعبؓ کے نسخہ میں مائدہ میں یونس کی بھی بہت سی آیتیں شامل تھیں، جو کسی میقاتی ترتیب میں رہا ہوگا، اور بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیتوں کو مائدہ سے ہٹا کر یونس میں کر دیا ہوگا، اس لیے ابن ندیم کا یہ کہنا کہ ابی بن کعبؓ کو التباس ہوگیا، صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ابن ندیم نے

موجودہ ترتیب کو پیش نظر رکھکر یہ بات کہی ہے، حالانکہ ابی بن کعب کا نسخہ موجودہ ترتیب پر تھا ہی نہیں،

اگر تاریخ یا حدیث کی کسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی راوی نے موجودہ پاروں یا موجودہ سورتوں سے زیادہ یا کم کچھ بیان کیا ہے تو اس سے بھی ناسخ و منسوخ کا شبہہ ہوجاتا ہے، اور بعض فرقے اس سے یہ غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاذ اللہ صحابہ نے قرآن کا کچھ حصہ حذف کردیا، پاروں کا شمار تو متاخرین کا ہے جو سہولت کے لیے اختیار کرلیا گیا، اس کو کسی اور ترتیب سے تیس کے بجائے چالیس بھی بنایا جاسکتا ہے، اس کی حیثیت ابواب (chapters) سے زیادہ نہیں ہے، اسی طرح سورتوں کے نام کا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بدلتے رہنا کوئی تعجب نہیں،

مذکورۂ بالا بیان کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک قرآن مجید کی تدوین کے تین طریقے رہے، ایک تو مخلوط مجموعہ جس میں قرآن کے علاوہ حدیث، تفسیر، فقہ سب چیزیں ہوتی تھیں، اس کی حیثیت گویا دائرۃ المعارف کی سی تھی، دوسرا طریقہ میقاتی ترتیب کا تھا، اور تیسرا آخری ترتیب جس کو حضرت عثمانؓ نے رائج کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک نئی ترتیب کا آغاز ہوا، سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے علمی ذہن و فکر رکھنے والے صحابی کو یہ خیال ہوا کہ قرآن کی آیتوں اور سورتوں کو ترتیب نزولی کے مطابق مرتب کیا جائے، چنانچہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ہی یہ کام شروع کردیا، حدیث میں آتا ہے کہ

عربی	اردو
عن محمد قال نبئت ان علیا	محمد کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ حضرت علیؓ نے
ابطأ عن بیعۃ ابی بکر، فلقیہ	حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کرنے میں تاخیر کی تو
ابوبکر فقال اکرھت امارتی	حضرت ابوبکرؓ ان سے ملے اور پوچھا کیا تم میری
فقال لا ولکن آلیت بیمین	امارت کو ناپسند کرتے ہو، انھوں نے جواب دیا

ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلوٰۃ حتی اجمع القرآن

نہیں یہ بات نہیں، بلکہ میں نے یہ قسم کھائی ہے کہ جب تک قرآن نہ جمع کر لوں، اس وقت تک صرف نماز کے لیے چادر اوڑھوں گا،

اس حدیث پر محمد بن سیرین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ

فزعموا انه کتبه علی تنزیله (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۱ مطبوعہ یورپ)

لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے شان نزول کے مطابق اس کو مرتب کیا۔

خدا معلوم اس جمع قرآن کا مقصد اور پس منظر حضرت علیؓ کے ذہن میں کیا تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خیال کیا کہ اس ترتیب سے آیات کے مطلب سمجھنے میں آسانی ہوگی، اور شان نزول پیش نظر رہنے سے مشکلاتِ قرآن کی بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی، اور نزول قرآن کی مرتب تاریخ سامنے آجائے گی، جو اس عہد کی تاریخ مرتب کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگی، حضرت علیؓ کا یہ کام اس حیثیت سے بہت مفید اور آیندہ قرآن مجید پر کام کرنے والوں کے لیے عمدہ نمونہ تھا،

حیرت کی بات ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ عظیم الشان کام محض اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے کیا جس سے عربوں کی قوتِ حافظہ پر بھی روشنی پڑتی ہے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ

عن علی علیه السلام انه رای من الناس طیرة عند وفاة النبی صلی الله علیه وسلم، فاقسم انه لا یضع رداءه حتی یجمع القرآن فهو اول مصحف عند اهل جعفر

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لوگوں نے بد فالی مراد لی ہے، اسلیے انھوں نے قسم کھائی کہ قرآن جمع کرکے ہی چادر اوڑھیں گے اور اپنے حافظہ سے یہ قرآن جمع کیا (ابن ندیم کہتے ہیں) میں نے حضرت علیؓ کے خط کا لکھا ہوا

ورأیت انا فی زماننا عند ابی یعلی حمزة الحسنی رحمه الله مصحفا قد سقط منه اوراق بخط علی بن ابی طالب یتوارثه بنو حسن علی مر الزمان وهذا ترتیب السور من ذلک المصحف.

(الفہرست ابن ندیم)

یہ قرآن اپنے زمانہ میں ابو یعلی حمزۃ الحسنی رحمۃ اللہ کے پاس دیکھا ہے، اس کے بہت سے اوراق نکل چکے تھے جو بنی ہاشم میں متوارث چلا آرہا تھا، اسکی ترتیب سوری یہ تھی (یعنی ابی بن کعبؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ کی طرح کی جو گذر چکی)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے اس صحیفہ کی ترتیب سوری ابن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کے مصحف سے ملتی جلتی تھی، اور خود ان دونوں بزرگوں کی ترتیب میں بھی میقات میں فرق ہونے کی وجہ سے کافی اختلاف تھا، اگر حضرت علیؓ کی ترتیب ان دونوں کے مشابہ تھی تو ضرور اس کی ایک جداگانہ شکل رہی ہوگی،

ابن ندیم کے قول "جمع فیه القرآن من قلبه" یعنی اپنے حافظہ سے جمع کیا، اور ابن سعد کی روایت "علی تنزیله" دونوں کا حاصل یہ ہے کہ یہ قرآن آیات کی ترتیب نزولی کے مطابق تھا، اور یہ ترتیب حضرت علیؓ نے اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے دی تھی، دوسری بات یہ کہ ابن ندیم کے اس قول سے جو خود شیعیت کی طرف مائل تھے، شیعوں کا سارا مفروضہ باطل ہوجاتا ہے کہ حضرت علیؓ کو خاص خاص آیتیں ملی تھیں، جو موجودہ قرآن میں نہیں ہیں اور ان کا قرآن موجودہ قرآن سے جداگانہ تھا،

صحابۂ کرام پر ان کا سارا افترا، اور بہتان دور ہوجاتا ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین قرآن میں علامہ طبرسی شیعی کا مشہور قول نقل کیا ہے کہ

الزیادة فی القرآن مجموع علیه

قرآن میں زیادتی بالاتفاق باطل ہے، البتہ

علی بطلانه، واما النقصان	کمی کا خیال عوام کے ایک طبقہ میں ضرور پایا جاتا ہے
فقد روی عن قوم من حشیۃ	لیکن صحیح قول اس کے خلاف ہے،

العامة والصحیح خلاف ذلک (تفسیر طبرسی ص ۶۰)

بلاشبہہ حضرت علیؓ کا یہ اقدام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دور صدیقی کا پہلا علمی کارنامہ ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورہ سے جو کام انجام دیا اس سلسلہ میں بڑی غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب حضرت ابوبکرؓ کے دور میں ہوئی، اس کی حیثیت سرکاری تھی، حالانکہ اسکی ترتیب عہد رسالت میں ہو چکی تھی، البتہ کتابی شکل میں مدون نہ ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے اسکو کتابی شکل میں کر دیا، امام سیوطی نفع السنن میں لکھتے ہیں:

کتابة القرآن لیست بمحدثه	قرآن کی کتابت (تدوین) کوئی نئی چیز نہ تھی
فانه صلی الله علیه وسلم کان	خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکو لکھوا دیتے تھے،
یامر بکتابته ولکنه کان مفرقا	لیکن وہ مختلف پرزوں، ہڈیوں میں اور
فی الرقاع والاکتاف والعسب	کھجور کی تیلیوں میں لکھا ہوا منتشر تھا، حضرت
وانما امر الصدیق بنسخها من	ابوبکرؓ نے اس کو ایک جگہ کتابی صورت
مکان الی مکان مجتمعا	میں مدون کرا دیا،

(تاریخ التشریع الاسلامی ص [illegible])

یعنی حضرت ابوبکرؓ نے قرآن پاک کی کوئی نئی ترتیب نہیں کرائی بلکہ عہد رسالت میں جو ترتیب ہو چکی تھی، اور اس کے اجزا مختلف چیزوں میں لکھے ہوئے تھے، ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے کتابی صورت میں کرا دیا، اور حضرت عثمانؓ نے اس کی نقلیں کرا کے سارے اسلامی ملکوں میں بھجوا دیں، اور اس کے علاوہ قرآن کی جو میقاتی ترتیبیں تھیں انھیں ضائع کرا دیا۔

قرآن مجید کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ نے بھی ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جن آیات قرآنی کی تشریح فرمائی تھی، ایک مصحف میں انکو جمع اور مرتب کرنے کا حکم دیا، ایک روایت میں ہے:

عن ابی یونس مولی عائشة قالت	حضرت عائشہؓ کے خادم ابو یونس بیان کرتے ہیں کہ
ان اکتب لها مصحفا وقالت اذا	حضرت عائشہؓ نے مجھکو ایک صحیفہ لکھنے کا حکم دیا
بلغت هذه الآیة فاذنی حافظوا	اور فرمایا کہ جب اس آیت حافظوا.....الخ
علی الصلوٰت والصلوٰة الوسطیٰ	پر پہنچو تو مجھے بتانا، چنانچہ جب میں اس آیت پر
فلما بلغتها آذنتها فاملت علیّ	پہنچا تو انھیں اطلاع دی، انھوں نے اسکی
حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰة	تفسیر میں لکھوایا کہ نمازوں کی حفاظت کرو خاصکر
الوسطیٰ وصلوٰة العصر وقوموا	درمیان کی نماز یعنی عصر کی، اور فرمانبرداری
لله قانتین ـ ثم قالت سمعتها من	بجالاتے ہوئے اسکے سامنے کھڑے ہو جاؤ،
رسول الله صلی الله علیه وسلم (ابوداؤد ص ۵۹)	پھر فرمایا میں نے اس (تفسیر) کو رسول اللہؐ سے سنا ہے۔

اس حدیث سے یہ شبہہ نہ ہو کہ پورے قرآن میں صرف صلوٰة الوسطیٰ کی تفسیر لکھوائی، بلکہ ابو یونس نے یہ واقعہ کسی ایسے موقع پر بیان کیا ہوگا جب اس سلسلہ میں کوئی اختلاف پیدا ہوا ہوگا کہ صلوٰة وسطیٰ سے کونسی نماز مراد ہے، ورنہ اسی طریقہ سے اس مصحف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ تمام تفسیریں جمع کر دی گئی تھیں، یہ کہنا چاہیے کہ انکی یہ تفسیر آئندہ تفاسیر کے لیے ایک نمونہ تھی، اسکی تقلید میں دوسری ازواج مطہراتؓ کو بھی شوق پیدا ہوا کہ وہ بھی اسی قسم کا مصحف مرتب کرائیں، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت حفصہؓ نے بھی اسی قسم کا ایک باتفسیر مصحف مرتب کیا تھا،

عن عمرو بن نافع انه قال کنت اکتب مصحفا لحفصة	عمرو بن نافع کی روایت ہے کہ میں ام المومنین حضرت حفصہؓ کیلیے
ام المومنین فقالت اذا بلغت هذه الآیة فآذنی	ایک صحیفہ لکھ رہا تھا، انھوں نے فرمایا جب اس آیت پر
حافظوا علی الصلوٰة والصلوٰة الوسطیٰ وقوموا لله قانتین	پہنچو حافظوا..... تو مجھے خبر کرنا، چنانچہ جب میں اس
فلما بلغتها آذنتها فاملت علیّ حافظوا علی الصلوٰ	آیت پر پہنچا تو انھیں خبر کی، انھوں نے لکھوایا کہ حافظوا علی الصلوٰة
والصلوٰة الوسطیٰ وصلوٰة العصر وقوموا لله قانتین	والصلوٰة الوسطیٰ وصلوٰة العصر وقوموا لله قانتین

(موطا امام مالک [illegible])

مکتوبات شیخ الاسلام مولانا شمس بلخیؒ

اور

سلطان غیاث الدین بنگالہ

از جناب مولانا سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف نمبر ۲ جلد ۸۲)

مجموعۂ مکتوبات میں دیگر مکتوب الیہم کے علاوہ خاص، سلطان ممدوح کے نام گیارہ مکتوبات مختصر و مطول ہیں، ان میں بعض مکتوب بجائے خود ایک مقالہ اور رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں، مکتوبات کے ذریعہ جس طرح اور ارادتمندوں کی مولانا نے ہدایت و دستگیری کی ہے، اسی طرح سلطان کی بھی ہر منزل میں رہنمائی کی ہے، اور ہر فکر و عمل میں ایک دستور پیش کیا ہے، ان گیارہ مکتوبات سے اگر ایک طرف مولانا کے قومی و ملکی نظریے معلوم ہوتے ہیں تو دوسری طرف ہدایت و تربیت کے طریقہ پر روشنی پڑتی ہے، ان مکتوبات کے مندرجۂ مضامین بہت اختصار سے مختلف عنوانات کے تحت پیش کیے جاتے ہیں،

مطالعہ مکتوبات اور فتوحات روحانی

مجاورت حرم کے سلسلہ میں مکتوبات مرسلہ کے بار بار مطالعہ کی تاکید ہے کہ جتنی بار مطالعہ ہوگا اتنی بار فتوحات روحانی بانداز دگر ظاہر ہوتے ہیں گے، اس سلسلہ میں کسی بزرگ کی ایک سبق آموز حکایت نقل کی ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کے مکتوبات کا مطالعہ پانچسو بار کیا تھا،[1] اور ہر بار اسرار و معارف نئے انداز سے ظاہر ہوتے رہے، ان مکتوبات کو مخفی اور محفوظ رکھنے کی بھی

[1] از مکتوب صد و شصت و سوم

ہدایت کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

مقصود آنکہ دوم آں فرزند است کہ باطن بر وی کشاید تا ایں ہمہ اسرار بر وی ریزم باید کہ[1] مکتوبات من کسے را نہ نماید و ہر بار کہ کلمات من مطالعہ خواہد کرد فتوحے دیگر و فہمے دیگر خواہد بود

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ فقیر مجاورت حرم بہ نیت کی نیت سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتا ہے الموت نہالک انشاء اللہ تعالیٰ۔ آمین

سعدیا گر قدمت را بپایاں نرساند — بارے اندر طلبش عمر بپایاں برساں

اب تو ملاقات یوم معلوم ہی میں ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔ قل ان الاولین والآخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم۔

ایک مکتوب میں مراسلت کی تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ہر ہفتے[2] کہ کشاید فرماے و بعزیزے در کلبۂ مکہ مبارک بر من فرستی امید وارم کہ مولاے من بر تو فضلہا و احسانہا بسیار خواہد کرد و در کشاد ہر ہفتے مرا علے دہی،

آیت کریمہ ومن یخرج[3] من بیتہ مہاجرا الی اللہ ورسولہ الخ کے زیر عنوان چند مکتوبات ہیں جن میں مختلف عنوان سے مہاجرت اور ہجرت اور دل کش و دل ربا خواب کا ذکر ہے، لکھتے ہیں کہ حرم کے کسی حجرہ میں میں آرام کر رہا تھا کہ دفعۃً حجرہ پر نور ہوگیا، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا، آپنے نہایت شفقت سے تین بار فرمایا کہ مولانا! یہ حجرہ متبرک میں تم کو عطا کرتا ہوں، اس میں تم رہو اور اپنے فرزندوں کو بھی لاکر اس میں ٹھہراؤ، یہ حجرہ وہ ہے جس میں فاطمہؓ اور میں رہا کرتا تھا، اب یہ حجرہ میں تمھیں دیتا ہوں، اس خواب دل کش کی کشش نے مجھے دیار محبوب میں پہنچایا

[1] از مکتوب صد و شصت و سوم [2] ایضاً [3] مکتوبات صد و پنجاہ و سوم و مکتوب صد و شصت و پنجم و مکتوبات صد و شصت و سوم

مولانا کے سفر حج کی گذرگاہ اور سلطان کی خدمت

آپ کے سفر حج کی گذرگاہ چٹگانوں تھی، اور جہازوں کے انتظام کی خدمت سلطان ممدوح کے ذمہ ہوئی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں کہ

بر آں[1] جملہ کہ ایں بیچارہ وداع حضرت علیا اعلاہ اللہ تعالیٰ درکنگورہ کردہ است و حالیے موسم قریب شدہ رسید بمرحمت بجانب کارکنان چٹگانوں فرمان شود کہ ایں فقیر را بادرویشانیکہ بنیت سفر خانہ کعبہ کرد ایں فقیر جمع شدہ اند، در جہازے اول رواں دارند۔ شاہ و آلِ شاہ از نکبات زمانہ مصئون و اعداء شاہ مقہور و معنون و عاقبت ہمہ بخیر و مقرون باد آمین،

سبیل اللہ کے معانی اور مجاہد کی حرمت

سبیل اللہ کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں[2] کہ درماندہ اور لاچاروں کے کاموں میں سعی کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، راہ میں پانی پلانے کا اہتمام کرنا، مسجدوں کی تعمیر کرنا، اور اہل و عیال کے نفقہ میں سعی کرنا وغیرہ تمام چیزیں سبیل کے تحت میں داخل ہیں، مگر اصطلاح شرع میں حسب ارشاد نبوی سبیل اللہ حاجیوں اور غازیوں کی راہ کو کہتے ہیں من اغبرت قدما لا فی سبیل اللہ وجبت لہ الجنۃ۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے عہد خلافت میں حضرت خالد ابن ولید کو کسی ملک و قوم پر فوج کشی کے لیے نامزد کیا اور اپنے ہاتھ سے سواری ان کے حوالہ کی، خالد بن ولیدؓ گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ ان کے ہمرکاب پیادہ پا جنگ آزمائی کی بابت ضروری ہدایات دے رہے تھے، خالدؓ نے عرض کیا، آپ خلیفۂ پیغمبر ہیں، یہ بڑی بے ادبی ہے کہ میں سوار اور آپ پیادہ پا ہوں، آپ نے فرمایا، خالد! تمھاری حیثیت اس وقت دوسری ہے، تم جہاد کے لیے جارہے ہو، اس لیے یہ روا نہیں کہ تم میری تعظیم کے لیے سواری سے اتر پڑو، اور میں اس وقت ایک مجاہد فی سبیل اللہ کے ہمرکاب بنیت جہاد راہ روی کر رہا ہوں، یہ کہکر جوتے پاؤں سے اتار کر ہاتھ میں لے لیے، اس سے

---

[1] مکتوب صد و پنجاہ و دوم [2] مکتوب صد و چہل و ششم

آپ کا منشا یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں قدم گرد آلود ہو جائیں، اور آپ ارشاد نبوی کے امید وار رحمت ہو جائیں، پھر فرمایا، روز قیامت غازیوں کے گھوڑوں کے بول و براز میزان قیامت میں وزن کیے جائیں گے اور مجاہد کے اعمال صالحہ میں محسوب ہوں گے، آخر میں لکھتے ہیں کہ

اعتقاد ایں فقیر آنکہ حق تعالیٰ ایں نعمت و دولت آں فرزند را مہیا و مہنا گردانیدہ است

سیاست قومی اور ملکی کے بصائر و حکم

آیت کریمہ[1] یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم الخ کے زیر عنوان سلطان ممدوح کو قومی و ملکی سیاست کے بصائر و حکم کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ کفار و مشرکین کو ہرگز محرم اسرار بنانا نہ چاہیے، جو لوگ مصلحت وقت کے پیش نظر ان کو اپنا معتمد گردانتے ہیں انھیں خبردار ہونا چاہیے کہ یہ مصلحت نہیں، سراسر مفسدہ ہے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے: لا یالونکم خبالاً ودوا ما عنتم الخ یہ وہ بد اندیش ہیں کہ مسلمانوں کی ایذا رسانی اور ان کے کاموں کی تخریب میں ہرگز کوتاہی نہ کریں گے، انکی تباہی و بربادی ان کی دلی تمنا و خواہش ہے، مسلمانوں کو ناصح مشفق کی نصیحت حق کو سننا اور اپنی عقل رکیک کو الگ کر دینا چاہیے، انھیں ایسا منصب اور عہدہ ہرگز عطا نہ کریں کہ وہ مسلمانوں کے والی و متولی بن بیٹھیں اور ان پر حکمرانی کرنے لگیں، اس کی مزید تائید اس آیۃ سے ہوتی ہے، لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذٰلک فلیس من اللہ شیئاً . . . . مشرکین و کفار کو مسلمانوں پر مسلط کر دینے اور حاکمانہ اقتدار دیدینے کی وعیدیں روایات میں بکثرت بڑی اور سخت ہیں، اور دشمنان دین و ایمان کی طرف سے جن مسلمانوں کو خطرات محسوس ہوتے ہیں، ان کے لیے من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب الخ کا وعدۂ حق کافی و وافی ہے،

---

[1] مکتوب صد و شصت و سوم

مسلمانوں کی حاجت روائی | مسلمانوں[1] کی حاجت روائی اور دلجوئی بہت بڑا کام ہے، انکی اعانت اور کاربرآری کے لیے صادق مصدوق علیہ السلام نے یہ بشارت دی ہے: واللہ فی عون العبد مادام العبد فی عون اخیہ۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے، اللہ اس کی مدد میں رہتا ہے،

حیات طیبہ | فرزند من[2]! تو بادشاہ اور جوان صالح ہے، اور بادشاہی چند پشت سے متوارث ہے اگر تو حیات طیبہ اور دنیا اور دین کے عیش و عشرت کا خواہشمند ہے تو آیت کریمہ: من عمل صالحاً من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ کے مطالب اور مقتضا پر نظر رکھ جو مومن صالح کے لیے وعدۂ دنیا ہے، اور آخرت کی جزا کے لیے ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون کا وعدہ ہے، اے دوست دنیا میں اللہ تعالیٰ کے وعدۂ رحمت وکرامت نامحدود ہیں، ان میں سے ایک وعدہ یرزق من یشاء بغیر حساب کا ہے، انسان کے اعمال محسوب اور محدود اور اللہ تعالیٰ کی عطا وجزا بے حساب وبے کتاب ہے جب اس حقیقت کا انسان پر غلبہ ہوتا ہے تو قعر ہفت دوزخ بھی اس کو اوج بہشت بریں نظر آتا ہے، "ھنیاء لارباب النعیم نعیمھا"۔ اگر سوال کیا جائے کہ بارگاہ کریم درحیم تک کیونکر رسائی اور باریابی اور منزل حق کیونکر طے ہو تو دوست من! دامن شرع خوب مضبوطی سے پکڑو اور اس کی پناہ ڈھونڈھو تو فتح وظفر اور عیش نشاط گوناگوں کا معاینہ کروگے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ جو شخص سورۂ تحریم یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک سے آخر تک ایک بار یا کم سے کم ہفتہ میں ایک بار پڑھ لے گا، اس کو حق تعالیٰ حصن شرع میں باریابی بخشے گا اور اس کا خاتمہ توبۃ النصوح پر ہوگا، اگر کہا جائے ایسے دور فتن میں شریعت اور اس کے

---

[1] [2] مکتوب صد وشصت وسوم

احکام پر گامزن ہونا دشوار ہے تو ایک عامی کی عقل رکیک میں یہ باتیں کیسے آسکتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ فیض الٰہی منقطع نہیں ہے، اور اس کی رحمت وقدرت اور فضل وعطا سے کچھ بعید نہیں ہے، ان ربک لذو مغفرۃ للناس علیٰ ظلمھم وان ربک لذو فضل عظیم و وسعت کل شئ رحمتہ پر نظر رکھو۔ ماں کی گود میں جس طرح بچہ راحت وسکون محسوس کرکے خوش ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح بندہ در مولیٰ پر راحت اور خوشی محسوس کرتا ہے، پس در مولیٰ پر جو لطف وخوشی حاصل ہو وہی اصلی خوشی ہے، ھنیئاً مریاً۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ

قرۃ فال آں فرزند مبارک ومیمون باد بالنبی وآلہ الامجاد

صحبت اور اس کے تاثرات | ابتداے آفرینش سے آج تک لائق قربت اور قابل صحبت خاصانِ خدا اور خاکسارانِ جہاں متقی وصالح رہے ہیں، نہ کہ وہ دیندار جو حرص وطمع میں پڑ کر بندگانِ خدا کو شریعت مصطفوی اور رضائے الٰہی کی راہ سے گمراہ کرکے غیر شرعی رسوم میں الجھاتے ہیں جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے، وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفیٰ الا من اٰمن وعمل صالحاً۔ اور ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ پس موافقت اور مصاحبت کے قابل صرف متقی وصالح ہی ہیں، صحبت کے اثر کی زندہ مثال سلطان فیروز شاہ دہلی کی ہے، جس نے بہت سے خاصانِ خدا وخاکسارانِ جہاں کو دیکھا اور اکثر مشائخ طریقت کو پایا، اور سید جلال الدین بخاریؒ کی چند روزہ صحبت کے اثر سے اس کو زیادہ فائدہ پہنچا، چنانچہ یہ اس کی عادت تھی کہ جب وہ غصہ کی حالت میں کسی کو قتل کردینے کا حکم دیتا تھا تو اسکے نفاذ سے پہلے اعتراف قصور کرلیتا اور معذرت خواہ ہوتا کہ وہ دراصل حکم ہی نہ تھا بلکہ میں نے محض غیظ وغضب میں یہ باتیں کہہ دی تھیں، اور اب میں اس حکم سے رجوع کرتا ہوں،

---

[1] مکتوب صد وشصت وسوم

غرضکہ اہم فیصلوں اور حکموں پر غور و فکر کے ساتھ نظرثانی کرتا، اور مفتیان شرع سے اس کے متعلق فتویٰ حاصل کرنے کے بعد حکم صادر کرتا، اور حکم دیتے وقت کہتا کہ خداوندا بندۂ فیروز حکم نہیں دے رہا ہے، بلکہ تیری شریعت حق حکم دے رہی ہے، دہلی میں سید بخاری کی تشریف آوری کے وقت شاہ ممدوح نے منادی کرادی تھی کہ بندہ فیروز پر جو بھی دعوی رکھتا ہو وہ آئے اور میرا دامن پکڑ کر دعوی کرے، میں اس کی سماعت کے لیے تیار ہوں، تہجد اور نماز چاشت کی پابندی سلطان کو سید موصوف ہی کے طفیل میں حاصل ہوئی، اور بھی اس قسم کے بہت فیوض و برکات ان سے حاصل کیے۔

آخر مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ

آں فرزند را خدا تعالیٰ عمر دراز بخشد و رہبری کلمات من او را اگیرا و در نافع تر آمد

فقراء کی محبت اور آثار محبت فرماتے ہیں[1] کہ فقراء اور درویشوں کی محبت اور ان کی ملاقات کا شوق اللہ تعالیٰ کی محبت اور لقا کا شوق ہے، جب محبت کمال کو پہنچتی ہے تو محبوب کے در و دیوار بلکہ اس کے کتے سے بھی محبت ہو جاتی ہے، مجازی محبت، محبت حقیقی کا دیباچہ ہو میوہ محبت ابھی خام ہے، جب پختہ ہوگا تو بادشاہ عزیز اس سے متمتع ہوگا، والذین اٰمنوا اشد حباً للہ[2]، مخلص مومنوں کی شان ہے، مگر درویشی درویشوں کی دوستی ہی سے حاصل ہوتی ہے، کسی اور عمل سے اس متاع گرانمایہ کا حاصل ہونا دشوار ہے، اور درویشوں کی دوستی خدا کی دوستی ہے، جو ان کا دوست ہوا وہ ان ہی کے ساتھ ہے اور رہے گا، اور جو ان کے ساتھ ہے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے، دوستی ہی قبولیت اعمال کی شرط اول ہے، پس ضرورت ہے کہ اس گوہر گرانمایہ کو حاصل کرنے کی سعی کرو کہ سرمایۂ کونین یہی ہے، بہت ہشیاری و بیداری سے

[1] مکتوب صد و شصت و سوم [2] جو ایمان والے ہیں وہ خدا کے سب سے بڑے دوست دار ہیں۔

کام لو، ایسا نہ ہو کہ دل دنیائے دنی کی محبت سے آلودہ ہو جائے، محبت مولیٰ اور یاد مولیٰ کا مقام پاک دل ہی ہے، اس پاک مقام کو مزبلۂ دنیا بنانا ایسا ہی ہے جیسے کعبہ میں بت پرستی کرنا، نعوذ باللہ۔

فردا کہ خاک مردہ بحشر آدمی کند　　اے باد خاک من مطلب جز بکوے دوست

جو محب آج اپنے محبوب کے ساتھ ہے، فردائے قیامت میں بھی اس محب کا حشر اپنے محبوب ہی کے ساتھ ہوگا، اگرچہ ان میں سے ایک مغرب میں ہو اور دوسرا مشرق میں۔ لا بعد مع المحبۃ محبت میں دوری کا کوئی سوال نہیں،

رزق جسمانی اور رزق روحانی ارشاد ہے کہ "نحن قسمنا بینھم معیشتھم الخ" جس طرح اجسام کے لئے رزق ہے اسی طرح ارواح کے لیے بھی ہے، اگر جسمانیات میں علی الموسع قدرہ و علی المقتر قدرہ کی تقسیم و تفریق ہے، تو روحانیات میں بھی ہے جس دل کو دنیائے دنی کے حرص و ہوا سے معمور کر دیا ہے، اس کو نعمائے آخرت سے اتنا تنگ کر دیا ہے کہ وہ ہوا و ہوس کے مزبلہ میں پھنسا اور دھنسا ہوا ہے، اور جس دل میں آخرت کی محبت اور آخرت کا ذوق و شوق دیا ہے، وہ دوسری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، محبان آخرت دنیا میں رہ کر بھی ہنگامۂ دنیا سے بیگانہ اور لطف دنیا سے بے ذوق ہوتے ہیں، ان کا رجحان صرف آخرت اور اہل آخرت کی طرف ہوتا ہے، اور فقراء و درویشوں سے ان کو محبت اور احسان و اخلاص سے ذوق ہوتا ہے، اور وہ قسمت روحانی سے بہرور ہوتے ہیں، ان کے علاوہ مخلصین کی ایک جماعت ہے جنھیں خاصہ کہتے ہیں، ان کے قدم دنیا میں ہوتے ہیں اور سر عرش آخرت سے لگا ہوتا ہے، خمخانۂ عشق و محبت کی غیبی شراب ان کا رزق ہے،

زہد اور زاہدانہ زندگی انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وہ ذوات مقدس جن کو اللہ تعالیٰ

نے نبوت کے ساتھ سلطنت و حکومت سے بھی نوازا ہے، ان کی زاہدانہ زندگی کو آیات و روایات
سے پیش کر کے سلطان کی تعلیم و تربیت فرماتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ اور حضرت
یوسفؑ علیہم السلام کی نبوت اور خلافت ارضی پر یاداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض الخ
اور ورث سلیمان داؤد الخ اور کذالک مکنا لیوسف فی الارض الخ کی آیات
شاہد ہیں، مگر ان کی زندگی یہ تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام درویشانہ خرقہ پہنکر شہر میں گشت کرکے
پوشیدہ طور پر لوگوں سے دریافت کیا کرتے تھے کہ تمہارا حاکم کیسا ہے؟ رعایا کے ساتھ اس کا
برتاؤ و سلوک کیسا ہے؟ ایک شب کو ایک اجنبی سے دریافت کیا کہ حاکم وقت کے بارہ میں
تمہارا خیال کیا ہے، اس نے جواب دیا وہ برا تو نہیں ہے، اچھا ہی ہے، مگر اپنا اور اپنے
اہل و عیال کا نفقہ محنت کرکے حاصل کرنے کے بجائے بیت المال سے لیتا ہے، یہ اجنبی حضرت
جبرئیل علیہ السلام تھے، جو انسانی شکل میں حضرت داؤد علیہ السلام کی تنبیہ کے لیے بھیجے گئے
تھے، یہ جواب سنکر حضرت داؤدؑ گھر پہنچے تو گریہ و زاری شروع کردی اور بارگاہ بے نیاز
میں عرض کی، بار الٰہا یہ بندۂ بیچارہ کوئی پیشہ نہیں جانتا تو ہی بتا کہ وہ کون پیشہ اور کیونکر
حاصل کرے، خدائے مجیب نے دعا قبول فرمائی اور لوہاری کی تعلیم دی، جیسا کہ ارشاد باری ہے:
والنا لہ الحدید ان اعمل سبغت وقدر فی السرد الخ چنانچہ آپ نے زرہ سازی کا پیشہ
اختیار کیا، ایک طرف کسب معاش کا یہ حکم تھا، دوسری طرف کسب آخرت کے لیے داعملوا
صالحا الخ کا حکم ہوا، حسب ارشاد عز اسمہ و تعالیٰ و ورث سلیمان داؤد اور وحشر
لسلیمان جنودہ من الجن والانس والطیر۔ ولسلیمان الریح الی ومن الجن من
یعمل بین یدیہ باذن ربہ اور نیز ومن الشیاطین من یغوصون لہ الخ، حضرت
سلیمان علیہ السلام کی حکومت جن و انس، وحوش و طیور اور بحر و بر سب پر چھائی ہوئی تھی،

اس کے باوجود آپ روزانہ ایک زنبیل اپنے ہاتھ سے تیار کرکے دو روٹیوں میں بیچتے تھے، ایک روٹی
تو اسی جگہ صدقہ کردیتے اور دوسری روٹی کسی محتاج مسکین یا مہمان کے ساتھ کھاتے۔

خود سلیماں گرچہ چنداں کار داشت — از زمیں تا عرش گیر و دار داشت
مسکنت را قدر چوں بشناخت او — قوت از زنبیل بافی ساخت او (عطار)

حضرت یوسف علیہ السلام جن کے بارہ میں نحن نقص علیک احسن القصص الخ
اور کذالک مکنا لیوسف فی الارض الخ وارد ہے، شاہانہ اقتدار اور دولت کی فراوانی
کے ساتھ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے اور رعایا میں عدل و انصاف کرتے تھے، ہمارے پیغمبر مصطفی علیہ الصلوٰۃ
والسلام کی زاہدانہ زندگی ان سب سے جداگانہ اور نمونہ تھی، آیت کریمہ ما لھذا الرسول یاکل
الطعام ویمشی فی الاسواق الخ کے تحت بعض مفسرین یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ اور فقیرانہ زندگی پر کفار فقر و افلاس کا طعنہ دیتے تھے، اس طعنہ پر اللہ تعالیٰ
نے فرشتہ کے ذریعہ آپ کے پاس دنیا کے خزانوں کی کنجیاں بھجوائیں اور یہ پیام کہلایا کہ آپ کو اختیار
دیا جاتا ہے کہ آپ نبی عبد اور نبی ملک میں سے جو بننا پسند فرمائیں اس کو اختیار کرلیں، اس سے
آپ کے نعمائے جنت میں کسی قسم کی کمی نہ ہوگی، اس وقت حضرت جبرئیل امین علیہ السلام حاضر خدمت
تھے، آپ نے ان سے مشورہ طلب کیا، انھوں نے زمین کی طرف اشارہ کیا، یعنی زمین کی طرح
تواضع اختیار فرمائیں، اس مشورہ پر آپ نے فرمایا کہ نبی عبد ہی بننا پسند کرتا ہوں، اس جواب پر
حضرت جبرئیلؑ نے آپ کو مبارکباد دی کہ حضور نے وہی پسند فرمایا جو مولیٰ کی مرضی تھی، اس طرح
آپ نے دنیاوی دولت و ثروت پر فقر و فاقہ کو ترجیح دی، آپ کی سادگی کا یہ حال تھا کہ گھر میں جھاڑو
دیتے اور چکی چلانے میں کنیز کا ساتھ دیتے، چولھا خود جلاتے، چٹائی اور بوریے پر آرام فرماتے،
معمولی لباس زیب تن فرماتے، ازار نصف ساق کا پہنتے، گھر کی ضروریات کی فراہمی کے لیے خود

بازار جاتے اور سامان خرید کر لاتے، یہ آپ کا خلق عظیم تھا، صحابہ کرامؓ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ کے خلق کی بابت استفسار فرمایا، آپ نے جواب دیا کہ کان خلقہ القرآن۔

روایت ہے کہ ایک روز محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام دونوں ہاتھوں سے کسی ایسی چیز کو ہٹا رہے تھے جو نظر نہ آتی تھی، حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ آپ کس چیز کو ہٹا رہے ہیں، کوئی چیز سامنے نظر نہیں آرہی ہے، فرمایا، دنیا آراستہ ہو کر میرے سامنے آئی تھی کہ میں اس کو قبول کرلوں، اسی کو ہٹا رہا تھا، جب وہ مایوس ہوگئی تو کہا خدا کے رسول میں آپ کے سامنے تو نہ آؤنگی مگر آپ کی امت کے سامنے سے ہرگز نہ ہٹوں گی،

روایت ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں کوئی اچھی چیز پیش کی گئی تو آپ نے ذکر فرمایا کہ یہ وہی دنیا ہے جو مجھ سے دور نہیں ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض الخ میں امت محمدی سے خلافت و حکومت کا جو وعدہ فرمایا تھا، وہ آجتک پورا ہو رہا ہے، اور انشاء اللہ آئندہ بھی پورا ہوتا رہے گا، اس مکتوب کے آخر میں فرماتے ہیں

بحمد اللہ ایں رکن زمین بادشاہ برخوردار ابا داد ایں ملک ظاہر است واز ملک باطن اخلاق حمیدہ و محبت مشائخ و علما بالغاً ما بلغ وجود وسخا وشجاعت وہمم عالیہ کہ ان اللہ یحب معالی الامور و یکرہ سفافہا ذات مبارک مجموعۂ صفات سینہ گردانید اشکروا نعمۃ اللہ لان شکرتم لازیدنکم

حقیقت درویشی اور درویش حقیقی

آیات: فمن الناس من یقول ربنا آتنا فی الدنیا وما لہ فی الآخرۃ من خلاق ومنھم من یقول ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار اولئک لھم نصیب مما کسبوا الخ

کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ اہل دنیا میں سے بعض دنیا اور صرف دنیا کے طالب اور بعض دنیا و دین دونوں کے طالب ہیں، اول الذکر مردود و مذموم اور دوسرے مسعود و محمود ہیں۔ لھم نصیب مما کسبوا[لہ] کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ ملک آخرت کی دولت مشقت و تعب کے بغیر تو حاصل ہوتی نہیں ہے

سعدی جفا نبردہ چہ دانند قدر یار
تحصیل کام دل بتکاپوے خوشتر است

طالبان آخرت کی تین قسمیں ہیں، ایک عوام مومنین جن کو لا الہ الا اللہ کا اقرار زبانی اور تصدیق دلی حاصل ہے، دوسری خواص مومنین یعنی عُباد و زہاد، تیسرے اہل اللہ اور خاصان خدا جو ترک دنیا کے ساتھ آخرت کے سامنے بھی سر نہیں جھکاتے بلکہ دنیا و آخرت دونوں سے آگے بڑھکر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے زیر قدم سر رکھتے اور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نقش قدم پر سر کے بل چلتے ہیں

زاہداں اندر جہاں خود کار شاں دارند لیک
پاکباز راہ او را باز کارے دیگر است

دنیاست بلاخانہ و عقبیٰ ہوس آباد
ما حاصل ایں ہر دو بیک جو نشانیم

خاصان خدا کی بھی دو حیثیتیں ہیں، ایک جماعت اپنے کو گوشۂ گمنامی میں اس لیے رکھتی ہے کہ گرد و غبار دنیا اور دنیا دار ان کے دامن عزت تک پہنچ نہ سکیں، دوسری جماعت خلق خدا کے درمیان رہنے پر مامور ہے تاکہ مخلوق خدا ان کے ظاہر و باطن سے برکات حاصل کرے، اور انکی صحبت اور پیروی سے سالک راہ ہو سکے، بے شبہہ علوم شرعیہ اور صلوٰۃ و صوم تلاوت قرآن کا مشغلہ مستحسن اور ضروری ہے، مگر خاصان خدا کی شان کچھ اور ہی ہے، جو عباد و زہاد کو بھی نصیب نہیں،

درویش وہ ہے جس کو ماسوا اللہ سے تعلق نہ ہو، جس کا دل دنیائے دنی سے اس طرح وابستہ

لہ مکتوب صد و ہفتاد و نہم لہ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے کاموں کا حصہ یعنی اجر نیک تیار ہے۔

ہو کر وہ مطلوب و مقصود بن جائے وہ ہرگز درویش نہیں ہے، ہمارے پیر طریقت فرماتے ہیں کہ درویش کی صفت یہ ہے کہ وہ نہ بہشت پر بار ہو نہ اس کے دل میں غبار رہو اور نہ کسی چیز سے اسکو سروکار ہو، بس ایک ہی ذات کی یاد سے آسودہ اور آرمیدہ ہو، یہی درویشی ہے، اور یہی سلطانی ہے، اس جہان اور اس جہان کی حقیقی سلطانی اسی کے دولت فتراک سے وابستہ ہے، اور بندہ اسی جماعت کے آستانہ کا خاک پوش ہے،

من از چہ از رخ تو ہمچو چشم بد دورم — ہزار ہمچو منِ سوختہ سپندِ تو باد

درویش وہ ہے جو ہر چیز سے کنارہ کش اور بے تعلق ہو، اس حقیقت کو آیت کریمہ للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم واموالهم يبتغون فضلاً من الله ورضواناً میں تلاش کرنا چاہیے، اس جماعۃ اللہ کا طرۂ امتیاز يبتغون فضلاً من الله ہے، وہ رضوان اللہ کا طالب ہے اور بس، عارف رومی اسی روحانی دولت کی بابت فرماتے ہیں:

خواجہ سلام علیک ملک بقا یافتی — آنچہ ز جان خوشتر است خواجہ کجا یافتی
ہم تو سلام علیک ہم تو علیک السلام — طبل خدائے بزن کیں ز خدا یافتی

عزیز من! خوب اچھی طرح غور کر لو، جب اغیار سے ترک تعلق کمال کو پہنچتا ہے جبھی محبوب سے پیوستگی کمال کو پہنچتی ہے، بس اس کو مختصر لفظوں میں یوں سمجھو کہ درویشی الانقطاع عما سوا ہے اور بس، حضرت شیخ قدس اللہ سرہ کی تقریر دلپذیر اس موقعہ کی یہ ہے کہ حقیقی درویش وہ ہے جس میں چار صفتیں ہوں، شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت۔ شریعت درویشی کا علم، طریقت اس کا قدم (عمل)، حقیقت اس کا حال اور معرفت اس کا کمال ہے، درویش میں اگر یہ چاروں صفتیں پیدا نہ ہو سکیں تو کم سے کم درویشی کا علم تو بہرحال ضروری ہے،

اگر تنگ شکر خرید می نتوانم ..... بارے مگس از تنگ می رانم

آخر میں فرماتے ہیں:

"این مکتوب بر طریق رسالہ درویشی نوشتہ ام تا بر شاہ یادگار این غریب نماند عاقبت و شما ہمہ مسلمانان باد"۔

تربیت روحانی اس عنوان کے تحت میں مختلف قسم کے مضامین اور تعلیمات ہیں، اور اس کی ابتدا احکام شریعت سے ہوتی ہے، فرماتے ہیں کہ وضو کا آغاز اور اختتام شہادتین پر ہونا چاہیے، وضو میں آداب وضو کا لحاظ ضروری ہے، حتی الامکان وضو اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہیے اور اثنائے وضو میں کسی سے کلام نہ کرنا چاہیے، اور سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر اور استغفر اللہ الذی لا الہ الا ہو الحی القیوم واتوب الیہ کے کلمات وردِ زبان رہنا چاہئیں، وضو کے بعد ہی دوگانہ تحیۃ الوضو ادا کرنا چاہیے، اور سجدہ میں امیدوار قبولیت کی دعا کرنا چاہیے، پنجگانہ نماز کے علاوہ چاشت اور تہجد بھی پڑھنا چاہیے، بعد مغرب دوگانہ نیت حفظ الایمان اس طرح ادا کرنا چاہیے کہ ہر رکعت میں بعد فاتحہ اخلاص سات بار، معوذتین ایک ایک بار اور یا حی یا قیوم ثبتنی علی الایمان تین بار پڑھی جائے، حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے غیر معین اوقات میں دوگانہ نماز حاجت کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نماز حاجت کے برکات و ثمرات بےحد ہیں، بندہ نے جنکو خود محسوس کیا ہے اور بارہا محسوس کیا ہے، اور اپنے مولیٰ سے جو کچھ طلب کیا ہے پایا ہے، یہ نماز کلید فتح و ظفر ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ سات بار اور سورۂ کافرون ایک بار، اور دوسری رکعت میں فاتحہ سات بار اور سورہ نصر اللہ ایک بار اور قعدہ اخیرہ میں درود ابراہیمی پڑھ کر سورہ بقرہ کی آخری آیتیں ربنا لا تواخذنا سے آخر تک پڑھی جائیں، اس کی سند حضرت شیخ کے حوالہ سے بیان کی ہے،

سورۂ کہف کے متعلق لکھتے ہیں کہ روزانہ اس کی تلاوت ہو سکے تو بہت بہتر ہے، ورنہ دوسرے دن،

اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ہفتہ میں ایک بار، جمعہ کو ضرور تلاوت کیجائے، روزانہ تلاوت کے بہت فوائد ہیں، اس سے دل خوش و خرم، توانا اور قوی اور زندگی خوشگوار رہے گی، اور کل کام خاطر خواہ انجام پاتے رہیں گے، انشاء اللہ۔ اسی طریقہ سے مختلف سورتوں کے فوائد بیان فرمائے ہیں،

علم نافع اور علم ضار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اللّٰھم انی اسئلک علما نافعا کے ورد کی تاکید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ نے "اعوذ باللہ من علم غیر نافع" یعنی علم غیر حسن و علم ضار و علم قبیح سے تعوذ فرمایا ہے اور "والذین اوتوا العلم درجات" اور "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" میں علم سے مراد علم نافع و حسن اور "یعلمون ظاہرا من الحیوۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ غافلون" میں علم ضار و قبیح مراد ہے، علوم ضار میں بعض تو سراسر کفر اور زینۂ کفر ہیں، اوامر و نواہی، حلال و حرام کا علم علم حسن ہے، "والذین اوتوا العلم درجات" کا منشا درجات علم ہیں، اور "وفوق کل ذی علم علیم" کا مفہوم یہ ہے کہ قلب کا علم قالب اور جسم کے علم سے بدرجہا بہتر ہے، علم صلوٰۃ یعنی رکوع و سجود اور قرأۃ و تعدیل اور ارکان نماز کا علم جسم سے متعلق ہے، اور حسب ارشاد نبوی "المصلی مناجی ربہ۔ نماز میں مولیٰ سے راز و نیاز" "واعبد ربک کانک تراہ" میں خشوع و حضور قلب "وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء" میں نفس و نفسانیت کی آلائشوں سے پاکی اور اخلاص علم قلب ہے، اور یہ علم ہدایہ اور بزدوی میں نہیں بلکہ صاحبان دل کے آستانہ سے ملتا ہے، علوم قلب کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے

علم عشاق را نہایت نیست لا یجوز و یجوز تا اجل است
(رومی)
علم رفتن براہ حق دگر است ایں ہمہ علم جسم مختصر است
(سنائی)

اور "تبتل الیہ وا تقوہ" اور "ربنا علیک توکلنا والیک انبنا" "والذین آمنوا اشد حبا للہ" خاص انبیاء علیہم السلام کا علم ہے اور یہ علوم ارباب قلوب سے متوارث ہیں،

"العلماء ورثۃ الانبیاء" سے مراد یہی ارباب قلوب ہیں، اور "ان للقرآن ظاہرا و باطنا" سے مراد وہی علم قلب ہے، اس لئے تلاوت قرآن میں غور و فکر کرنا چاہیے کہ اسرار قرآن ظاہر ہوں،

توبہ اور استغفار روحانی تربیت کے سلسلہ میں توبہ و استغفار کی بھی ہدایتیں ہیں، توبہ و استغفار کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ قدس سرہ العزیز فرماتے تھے کہ ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ امت محمدی کو دو نعمتوں سے امان و پناہ حاصل تھی اور اب بھی ہے، ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، دوسری استغفار، ایک نعمت تو ہمارے درمیان سے اٹھ چکی، دوسری باقی ہے اور اس کا دروازہ اس وقت تک کھلا رہے گا جب تک مغرب سے آفتاب طلوع نہ ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد استغفار فرمایا کرتے تھے اور ہر روز ستر بار استغفار فرماتے تھے، فتح مکہ کے بعد جب سورۂ نصر کا نزول ہوا تو استغفار کی تعداد سو بار کر دی، بخاری کی ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے عرض کی کہ حضور مجھے استغفار کے کلمات تعلیم فرمائیں جن کو میں نماز کے بعد پڑھا کروں، آپ نے فرمایا: اللّٰھم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفر لی مغفرۃ من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم۔ توبہ و استغفار کے بہتیرے فوائد و برکات ہیں، اس سے گناہوں کی مغفرت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ بندے کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے، دل کو راحت اور روح کو سرور حاصل ہوتا ہے، مشکلات حل اور رزق حلال میں وسعت ہوتی ہے

سلطان پر مولانا کی توجہ خاص سلطان مولانا موصوف کے مخلص اور مجاز مریدوں میں تھا، مولانا نے اس کو جبہ و عمامۂ خاص اور حضرت شیخ مخدوم جہاں قدس سرہ کا آئینہ خاص عطا فرمایا تھا، فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ جب جبہ و دستار سے آراستہ ہو جاتے تو فقیر آئینہ پیش کرتا اور آپ اسمیں روئے مبارک دیکھتے، آپ کے وصال کے بعد یہ متبرک آئینہ گم ہو گیا، پھر ایک مدت کے بعد وہ دستیاب

آئینہ کسی نے لاکر فقیر کو دیا، اس لیے فقیر کے لیے وہ نعمت کبریٰ اور تبرک عظیم ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ

ہماں آئینہ بحضرت شاہ ارسال کردہ شد ایں نعمت و برکت شاہ ارزانی بود و

روشنیہا دہد دینًا و دنیاً انشاء اللہ تعالیٰ، طفیل آں آئینہ دستار و یارانی کہ روز جمعہ

پوشیدہ بودم فرستادہ ام

سلطان کی مدت حکومت اور شہادت ایک روایت کے مطابق سلطان نے سات سال چند ماہ اور ایک روایت کے مطابق سولہ سال پانچ مہینے عدل و انصاف سے حکومت کرنے کے بعد ۸۲۲ھ میں راجہ کانس (گنیش) زمیندار بھتوریہ بنگالہ کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

گلہائے پریشان

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج) ضخامت کتاب ۸۰۰ صفحات،

تقطیع بڑی، قیمت: ۷ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ: کتابستان الہ آباد

گلہائے پریشاں" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے، آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں، ان کے متعلق سرخیاں قائم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق سرخیاں ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ ہے تو وہ بھی درج کر دیا گیا ہے اساتذۂ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں، اردو ادب میں یہ کتاب ایک دل کش و دلفریب اضافہ ہے۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

وفیات

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی

مولانا مرحوم سے خط و کتابت عمر بھر میں دو بار ہوئی۔ ملاقات صرف ایک بار، وہ بھی ان کے آفس میں چند منٹ کے لیے ڈیوٹی سوسائٹی سے متعلق غالباً ۱۹۴۸ء کے آخر میں! اس طرح میں ان لوگوں میں ہوں جو مرحوم کے بارے میں براہ راست بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ مرحوم کی نجی، قومی یا علمی زندگی سے اسی حد تک متعارف ہوں جس حد تک کتب، رسائل، تقاریر اور مختلف اشخاص کی مدد سے میری جیسی محدود فہم و فکر کا آدمی مولانا جیسی عظیم شخصیت سے ہو سکتا ہے!

بہت سے دوسرے اصحاب کے مانند مولانا سے میری غائبانہ اور بہت گہری عقیدت اُس وقت سے ہے جب بلقان اور طرابلس کی جنگ برپا تھی۔ الہلال میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے اور میں اسکول کا طالب علم تھا۔ کیسے اچھے وہ دن تھے جب جینے کی ہر خوشی اپنے دیار اور اپنے عزیزوں اور دوستوں میں نصیب تھی اور اس سے کم خوشی مجاہدوں کے دیار میں جان دینے کی اس دعوت و بشارت میں نہیں ہوتی تھی جو مولانا کی آتش نوائی میں ملتی تھی۔

عمر کا وہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا جب اچھے اور بڑے کاموں کے لیے جیتے رہنے اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی ہوتی تھی۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد کس کو نہیں عزیز ہوتی، بالخصوص بوڑھوں کو جنھیں صرف ماضی کی جائے پناہ میسر ہوتی ہے، اس لیے یہ کہنا کہ وہ عہد کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا، واقعہ کے اعتبار سے ممکن ہے اتنا صحیح نہ ہو جتنا اپنی یاد کے اعتبار سے میرے لیے حسین و حزیں ہے! بہرحال وہ زمانہ کب کا ختم ہوا اور زمانہ بھی کیا کرے اسکی تقدیر ہی یہ ہے، آج مولانا آزاد بھی اس جہان سے اٹھ گئے کس کو یاد کر کے کس کا ماتم کروں!

مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں۔ وہ آفرینندہ عہد تھے، اس لیے انکی کشمکش لیے لوگوں سے رہتی جو زائیدہ عہد ہوتے۔ وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے اسکا احساس آج ہو رہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے، کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے ہی وقت ہوتا ہے!

سیاسی پلیٹ فارم پر مولانا کے آنے کا وہی زمانہ تھا جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک ملک میں پھیل چکی تھی اور ہز ہائینس آغا خاں اور مولانا محمد علی اور شوکت علی بھی ہمارے ویسے ہی ہیرو بنے ہوئے تھے جیسے بلقان اور طرابلس کے جانباز مجاہد! اس سے پہلے مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی اور تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ کا عمل اور ردعمل بھی سامنے آچکا تھا۔ برطانوی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے مولانا آزاد نے ہندوستانی قومیت کے متحدہ محاذ کا انتخاب کیا۔

اصولاً وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک اور مسلم لیگ کے پروگرام کی تائید میں نہ تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ دونوں کو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ اس عقیدے کی حمایت میں ان پر کیسے کیسے حادثات نہیں گزر گئے، دو چار مہینے یا سال نہیں کم و بیش نصف صدی تک گزرتے رہے!

قطع نظر اس سے کہ مولانا نے اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے کس محاذ جنگ کا انتخاب کیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا، مجھے جو چیز سب سے عجیب اور عظیم نظر آئی وہ ان کا اپنی فراست پر بھروسہ اور اپنے عقیدے کی محکمی تھی۔ کتنی مدت پہلے انھوں نے اسی فراست کی روشنی میں جو راستہ اختیار کیا اور جس منزل کو سامنے رکھا اس سے تمام عمر سرمو انحراف نہیں کیا۔ اس زمانے میں تذبذب اور تفرقے کی کیسی کیسی زراع اور نزاکتوں کا سامنا ہوا اور ان کی زد میں آکر کیسے کیسے ساتھیوں نے فکر و عمل میں کیسے کیسے رد و بدل کیے لیکن مولانا نے اپنے اختیار کیے ہوئے راستے سے منہ نہ موڑا۔ سیاست کے صحیفے میں اس طریق عمل کو کبھی کبھی نہیں بھی سراہا گیا ہے لیکن اس کو کیا کہیے کہ بالآخر ان تمام چھوٹے بڑے ساتھیوں اور سرداروں کو جو سیاست کے الیاس و خضر یا قیس و کوہکن سمجھے جاتے تھے، اسی راستہ پر آنا اور اسی کعبۂ مقصود کی طرف پلٹنا پڑا جو مولانا کا بتایا ہوا تھا!

مولانا کا ایک فقرہ اس وقت یاد آرہا ہے، جو کہیں کہیں یا تو نظر سے گزرا ہے یا سننے میں آیا۔ کچھ اس طرح

کی بات کہی ہے کہ تم لوگ پانی اور کیچڑ کو دیکھ کر بارش کا یقین کرتے ہو میں اس کو ہوا میں سونگھ کر جان لیتا ہوں۔ دنیا کے کم لیڈروں کو یہ درجہ نصیب ہوا ہے!

بلقان اور طرابلس کی جنگوں کا نعرہ مولانا کی زبان اور قلم سے نکل کر پہلی بار ہمارے کانوں میں گونجا اور دل میں اتر گیا۔ ان کی تحریر و تقریر کی بجلیاں اور زلزلے ہندوستان میں وہی کام کر رہے تھے جو مسلمان مجاہدین یورپ اور افریقہ کے میدان کارزار میں اپنے لہو اور تلواروں سے انجام دے رہے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی ہمارا تصور تاریخ اسلام کی کتنی صدیوں اور کھنڈروں کو روندتا کھوندتا اس عہد شرف و سعادت میں پہنچ جاتا جہاں شیدایان داد شجاعت و شہادت دے رہے تھے۔ اس زمانے میں مولانا یا ان کے اخبار الہلال کے خلاف حکومت جب کوئی تادیبی کارروائی کرتی، اخبار سے ضمانت طلب کی جاتی یا مولانا کو نظربند کر دیا جاتا تو ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے مسلمانوں کا کوئی جانباز جنرل میدان جنگ میں اسیر ہو گیا یا کام آگیا۔ بلقان اور طرابلس کے معارب (حق و باطل کی جنگ)، جہاں کہیں جب کبھی برپا ہونگے مولانا کی تحریریں اور تقریریں دعوت دار و رسن دیتی رہیں گی!

یہ پہلا موقعہ تھا جب مولانا کی تحریروں کے طفیل ہندوستان کے مسلمانوں کو دور دراز بکھرے ہوئے مسلمانوں کی ابتلا و آزمائش میں شریک ہونے کا احساس و افتخار ہوا، گو یہاں اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے دکھ درد میں شریک ہونے کی توفیق باہر کے مسلمانوں کو کبھی نہیں ہوئی، نہ وہاں کے زعما کو نہ عوام کو! اور یہ اس ہندوستانی مسلمان کا کارنامہ ہے جس کی ہندوستانی قومیت کی محکمی سے کٹر سے کٹر ہندو اور جس کے اسلامی تصورات، مذہبی معتقدات اور دینی خدمات سے کٹر سے کٹر مسلمان انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بایں ہمہ ہندوستانی قومیت کی حمایت میں جتنا ظلم و جور اپنے ملک کے مسلمانوں کے ہاتھوں مولانا ابو الکلام نے اٹھایا وہ ہندوستان میں شاید ہی کسی دوسرے مسلمان کے حصہ میں آیا ہو۔

گاندھی جی اور مولانا ابو الکلام کی زندگیوں میں ایک بات کتنی المناک لیکن اتنی ہی عظیم الشان نظر آتی ہے مسلمانوں کی حمایت اور غم خواری میں اور اس وقت جبکہ مسلمانوں کے جان و مال و آبرو کی

کوئی قیمت اور وقعت نہیں رہ گئی تھی، گاندھی جی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کی گولی کا نشانہ بنے۔ مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہو گی لیکن فرطِ افتخار سے سر اونچا ہو جائے گا اگر کبھی یہ معلوم ہو سکا کہ گاندھی جی کی طرح کسی بڑے مسلمان کو غیر مسلموں کی حمایت میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا! ہندوستان کی دو اتنی بڑی ہستیوں کے ساتھ ان کے ہم مذہبوں نے کیا سلوک کیا اس پر کسی اور کو نہیں ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ضرور غور کرنا چاہیے!

تقسیم ملک سے ابتک ہندوستان کی سیاست جن دشواریوں اور نزاکتوں سے گذری اور ابتک گزر رہی ہے اس کو تفصیل سے بیان کرنا تو ضروری معلوم ہوتا ہے نہ میرے بس کی بات ہے لیکن اس دوران میں حکومت ہندوستان کی خارجی اور اندرونی پالیسی پر مولانا کی سیاسی بصیرت، آہنی تدبر، اخلاقی بلندی، علمی فضیلت اور شخصی وقار کس طور پر اثر انداز ہوتا رہا کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور نگہداشت کے نہایت درجہ مشکل اور نازک فرائض جس خاموشی، دلسوزی اور قابلیت سے مولانا نے انجام دیے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ مولانا کی خدمات کی اہمیت اسلیے اور بڑھ جاتی ہے کہ ان کو مسلمانوں کی حمایت اور ان کے گرتے ہوئے حوصلوں کو اونچا کرنے اور رکھنے کے فرائض ایسے حالات اور ایسے زمانے میں انجام دینے پڑے جن سے زیادہ مشکل اور نازک زمانہ مسلمانوں پر اس برصغیر میں شاید پہلے کبھی نہیں گذرا تھا۔

مولانا نے جس طرح جس حد تک جن دشواریوں سے دوچار رہ کر جس کامیابی کے ساتھ ہندوستان کے تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور تقویت پہنچانے کی خدمت انجام دی اس سے بڑی خدمت اس سیکولر جمہوریہ کی ساکھ اندرون و بیرون ملک قائم کرنے میں کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا۔ ہندوستان کی حکومت مولانا کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی! کس عظمت اور کیسی عبرت کا یہ مقام تھا کہ یہ فریضہ یکہ و تنہا اس مسلمان کے حصے میں آیا جس سے زیادہ مطعون اور مغضوب تقسیم ملک کی رات سے پہلے مسلمانوں کے نزدیک دوسرا مسلمان نہ تھا!

ہندوؤں یا حکومت ہند میں یہ غیر معمولی ساکھ مولانا نے محض حسن اتفاق سے نہیں پیدا کر لی تھی۔ ہندو تو پھر ہمارے ہی آپ جیسے انسان ہیں ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں اور رہے ہیں جن میں مولانا کسی سے پیچھے نہیں اور بہتوں سے آگے تھے جن کا سابقہ انسانیت سے ناآشنا وحشیوں سے ہوتا تو وہ ان میں بھی اپنی سرداری مسلم کرا لیتے! سفاکی یا چالاکی سے نہیں برگزیدگی اور بہادری سے۔ مولانا کو صبر و صداقت کی کتنی آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہو گا تب کہیں جا کر یہ منزلت حاصل ہوئی ہو گی۔ 'بزیر شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را' کا جیسا اجر جو مولانا پر گزرا ہو گا، اس کا احساس ان لوگوں کو کیسے دلاؤں جو نہ اس صورتِ حال سے آشنا ہیں جن میں مولانا گرفتار تھے نہ اس کرب سے جو شاعر نے اس شعر میں بھر دیا ہے!

حکومت میں مولانا کو بعض ساتھیوں کے تعصب اور تنگ نظری کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا تھا، کسی غیرتمند کو نہیں کرنا پڑتا! یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب نامساعد حالات کا ہجوم تھا۔ ان پر جو گذرتی تھی اور کیا کچھ نہیں گزرتی تھی اس کو وقار اور خاموشی سے سہتے تھے۔ مولانا کو اپنا ہم خیال بنانے میں کبھی تامل نہیں ہوا لیکن اپنا غمگسار بنانا انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ یہ ان کی طبیعت کا بڑا ممتاز خاصہ تھا۔ وہ اپنے عزائم کے سامنے کسی دشواری کو ناقابل تسخیر نہیں سمجھتے تھے، دنیوی جاہ و منزلت سے بے نیاز تھے۔ کسی سے جھگڑتے نہیں تھے، جھگڑنا اپنے رتبہ سے فروتر سمجھتے تھے لیکن اس کی نوبت آجاتی تو اپنی سطح سے نیچے نہیں اترتے تھے۔ حریف کے مقابلہ میں یہ انکی پہلی جیت ہوتی تھی!

علم کی معرفت اور مذہب کے شرف و سعادت نے ایسی بلند نظری اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی کہ وہ زندگی کے مصائب و مکروہات اور سیاست کے شور و فتن سے پراگندہ خاطر اور تلخ کام نہیں ہوتے تھے۔ جو شخص ہار جیت دونوں میں اپنا سہارا خود ہو اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوئے ہیں جو نارمل ہوں اور اپنا سہارا خود ہوں!

یہاں دو واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، ایک دہلی کی سب سے بڑی مسجد میں پیش آیا، دوسرا

ہندوستان کے سب سے بڑے ایوان حکومت میں! ۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں شمالی ہند کے مسلمان بالعموم اور دہلی کے بالخصوص تقسیم ملک کے تہلکے سے ہراس اور درماندگی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان میں کوئی مسلمان لیڈر ایسا نہیں رہ گیا تھا جو ان کو ڈھارس دیتا یا ان کی حمایت میں آگے آتا بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ لیڈر خود سراسیمہ اور درماندہ تھے!

مولانا دہلی کی جامع مسجد میں تشریف لائے جو مسلمانوں کے جبروت و جلال، شوکت و شادمانی، اقبال و اختلال کی کتنی کروٹیں دیکھ چکی تھی۔ مسلمانوں کے خاموش، مایوس اور ملول مجمع کو دیکھا جیسا مجمع آج سے پہلے انھوں نے، نہ کسی اور نے ہندوستان میں کبھی دیکھا تھا۔ پھر جیسے بوڑھے سردار کی شریانوں میں خون کے ساتھ عزیمت اور حمیت کے شرارے کوندنے لگے ہوں لیکن اپنے وقار پر قابو رکھتے ہوئے جو اس کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا تھا، بولنا شروع کیا......... یہ تقریر اردو کے بیشتر اخبارات میں تمام و کمال چھپ چکی ہے اور پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو اس کے اکثر ٹکڑے زبانی یاد نہ ہوں۔ چاہا تھا کہ ناظرین کی خاطر جہاں تہاں سے اس کے اقتباسات ہی پیش کر دوں لیکن اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی کہ کس حصے کو حذف کیا جائے اور کس کو نہیں اس تقریر پر تبصرہ بجائے خود ایک مضمون بن جاتا اس لیے بادل ناخواستہ ارادے سے باز رہنا پڑا،

جامع مسجد کی اس تاریخی تقریر سے مسلمانوں کے حوصلے بندھے اور خوف و مایوسی کی تاریکی چھٹنے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے زلزلے کے بعد زمین کی شکست و شکن میں ہمواری اور اس زمین پر بسنے والوں کے پاؤں میں استقامت آگئی ہو!

کسے معلوم مولانا ان کی اس تقریر اور اس مجمع کے ہلکے گہرے نقوش جامع مسجد کے سنگ و خشت، سقف و در، مینار و محراب نقش و نگار میں کس نامعلوم طریقے سے پیوست یا مرتسم ہو گئے ہوں! اور خدا ہی جانتا ہے کہ قوم کی تقدیر میں ان کی بازگشت کب اور کس طور پر سنائی دے!

دوسری تقریر پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کے اس اتہام لگانے پر کرنی پڑی کہ وزارت تعلیمات ہند کی

سے سرد مہری برت رہی ہے اور اردو کی بے جا پاسداری کرتی ہے۔ اس اتہام کے پیچھے کھلے چھپے کتنے اور الزامات تھے جن کا اندازہ کرنا ایسا کچھ دشوار نہیں۔ مولانا نے پارلیمنٹ کے آداب اور خود اپنی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس وقار برہم اور صداقت بے باک سے جواب دیا وہ ایک ناقابل فراموش تاریخی واقعہ بن گیا ہے۔ اس کی روداد بھی اخباروں میں آچکی ہے جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ پوری پارلیمنٹ جس کے ارکین میں سے شاید بہتوں نے مولانا کی یہ تقریر پورے طور پر سمجھی بھی نہ ہو مولانا کے خطاب سے سناٹے میں آگئی، سکوت کا یہ عالم اور سطوت کا یہ سماں ہندوستانی پارلیمنٹ میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو! اس کے بعد اردو کی حمایت کرنا شیوۂ شرافت و انصاف سمجھا جانے لگا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اس تاریخی جلسے میں جو دہلی میں گذشتہ موسم سرما میں ہوا تھا، مولانا کی اردو کی حمایت میں آخری تقریر ہوئی۔ اس کے بعد ہی اردو کا سب سے بڑا خطیب اردو کا سب سے شاندار انشا پرداز اور اردو ہی کی کتنی حسین اور عظیم شخصیت ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

اب دیکھیے اردو کے باب میں

کسے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ!

رینائسنس (احیاے علوم) اور ریفرمیشن (اصلاح دین) کی دو ایسی زبردست اور عدیم المثال انقلابی تحریکیں یورپ میں برسرکار آئیں جنھوں نے یورپ کو دنیا کی تمام دوسری اقوام سے یکلخت اس درجہ بلند کر دیا کہ دوسری قوموں کو صدیوں بعد تک ان مدارج تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا، ان تحریکوں نے جو کچھ کر دکھایا تاریخ عالم کے بڑے بڑے کشورکشاؤں کے حصے میں نہ آیا تھا۔ انسان کی صالح اور صحت مند پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے میں مذہب (اعتقاد) اور علوم بڑے زبردست اور پائدار محرکات ثابت ہوئے ہیں۔ اسلام کا ظہور بجائے خود اصلاح ادیان اور احیاے علوم کی براہ راست بشارت تھا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رینائسنس اور ریفرمیشن دونوں بڑی حد تک اسلام کا عطیہ ہیں! لیکن مسلمانوں کی عام غفلت اور ان تحریکوں کے غیرمعمولی غلبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ

مسلمان حکومتیں اور مسلمانوں کے عقائد اور اعمال دونوں مغربی افکار اور استعمار کی زد میں آ گئے اقبال نے ٹھیک کہا ہے کہ جو قومیں اپنے اعمال کا حساب نہیں لیتی رہتیں ان کو ایسے ہی برے دن دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو ایک طرف اپنی حکومتوں کو، دوسری طرف اپنے افکار و عقائد کو ان قوتوں سے محفوظ رکھنے کی مہم کا سامنا تھا۔ حکومتوں پر کیا گذری یا گذر رہی ہے یہاں خارج از بحث ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تبدیلی اور اصلاح سب سے دیر میں حکومتیں قبول کرتی ہیں اور ان کا احساس و اظہار سب سے پہلے قوم کے ارباب فکر و نظر کرتے ہیں۔

اسلامی عقائد و افکار کو مغربی اور مروجہ عقائد و افکار کی روشنی میں پرکھنے اور تعبیر کرنے کا فریضہ ہندوستان میں غدر کے بعد جن بزرگوں کے حصہ میں آیا ان میں بعض یہ ہیں: سر سید، جسٹس امیر علی، شبلی، اقبال، ابو الکلام اور مولانا مودودی۔ ان سب کا مقصد ایک تھا، طریقۂ کار و استدلال جدا تھا۔ یہ صورت حال مقامی نہ تھی، عالمگیر تھی۔ مصر اور دیگر بلاد اسلامیہ میں جمال الدین افغانی، مفتی عبدہٗ، رشید رضا وغیرہ کے سامنے بھی یہی مسائل تھے۔

یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دینا غیر متعلق نہ ہوگا کہ اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی ہندو عقائد اور قومیت کے احیا، اور تشکیل نو کی تحریک تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جس کے اہم مرکز دکن، بنگال اور پنجاب میں تھے۔ یہی نہیں بلکہ بدیسی کمپنیوں کی دیکھا دیکھی ہندو سرمایہ دار بھی صنعتی اور اقتصادی محاذ پر پورے طور سے منظم ہو چکے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کی کیا حیثیت بن گئی تھی اور مسلمانوں کی کیا رہ گئی تھی!

غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن دشواریوں میں مبتلا تھے، ان میں بعض یہ تھیں:
مغلیہ حکومت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کا قیام، انگریزوں کا مسلمانوں سے برہم اور برگشتہ ہونا، مسلمانوں کا ضرورت سے زیادہ کبھی آئین نو سے ڈرنا اور طرز کہن پر اڑنا، اسی طرح کبھی طرز کہن سے ڈرنا

اور آئین نو پر اڑنا، مذہبی اور تہذیبی احیا، اور سیاسی و صنعتی تنظیم میں ہندوؤں کی پیش قدمی، مسلمانوں کی سیاسی کس مپرسی، اقتصادی بد حالی، صنعتی پسماندگی، تعلیمی پستی اور عام مایوسی و درماندگی۔ سر سید نے ان کا مداوا بحیثیت مجموعی علی گڑھ تحریک میں پیش کیا جس کی مرئی اور متعین شکل مدرسۃ العلوم کی تھی جو اب مسلم یونیورسٹی ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک اور مسلمانوں کے لیے غدر انیسویں صدی کا سب سے المناک انقلابی حادثہ تھا جس نے ہندوستان میں ان کی کئی سو سالہ سیاسی اور تہذیبی حیثیت کو کلیۃً زیر و زبر کر دیا۔ مسلمانوں میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے فکر و عمل کے لیے یہ صورت حال ایک بے اماں و بے درماں آزمائش سے کم نہ تھی۔ نظر بر آں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کی اس بنیادی اور تاریخی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں مسلمانوں کی تقریباً ہمہ جہت آباد کاری و بہرہ مندی کا مشن بھی تھیں اور مشین بھی! اور اپنے گوناگوں مقاصد کے حصول میں جو کبھی کبھی ایک دوسرے کے ضد معلوم ہوتے تھے براہ راست یا بالواسطہ اس حد تک کامیاب ہوئے، جس حد تک ہندوستان کا کوئی اور مسلم ادارہ اب تک کامیاب نہیں ہوا تھا۔

کچھ تعجب نہیں سر سید اور ان کے رفقا نے علی گڑھ تحریک اور مدرسۃ العلوم (مسلم یونیورسٹی) کو کسی نہ کسی حد تک دانستہ یا نا دانستہ طور پر رینائسنس اور ریفرمیشن کی روشنی میں آگے بڑھانے کی کوشش کی ہو۔ اس خیال کو اس بنا پر اور تقویت پہنچتی ہے کہ اصلاح دین کی تحریک دہلی میں مدتوں سے برسر کار تھی، جو سر سید کے عہد میں اور زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا گھرانا اس تحریک میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھا۔ اسی اصلاح دین سے احیائے علوم کے چشمے پھوٹتے تھے۔ پرانے زمانے میں مسلمان ہی نہیں دوسری اقوام میں بھی علوم کا سرچشمہ مذہب تھا۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات و حوادث سے دوچار تھے ان کے پیش نظر علی گڑھ تحریک میں کچھ اور مقاصد بھی شامل کر لیے گئے تھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں رینائسنس اور ریفرمیشن کی قیادت کے لیے جس عظیم اور جامع حیثیات شخصیت کی ضرورت تھی وہ صرف سرسید کی تھی۔ انیسویں صدی کے خاتمہ پر سرسید رحلت فرما گئے، بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی نے جو رنگ اور رخ اختیار کیا اس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا اس کی قیادت اتنی حرکی، محکم اور ہمہ جہتی نہ تھی جتنا کہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس وقت ایک نئے سرسید کی ضرورت تھی۔ میرے نزدیک یہ رول مولانا ابوالکلام نے ادا کیا۔

سرسید ہی کی طرح وہ اعلیٰ خاندانی روایات، اسلامی علوم، اسلامی تاریخ، اسلامی عقائد، اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب و اخلاق کے حامل اور مبلغ ہونے کے علاوہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے، زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں اور رجحانات کو پہچانتے تھے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور طاقت رکھتے تھے۔ مخالفت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو اسکا مقابلہ شرافت، قابلیت اور پامردی سے کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق اور تحریر و تقریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ البتہ ایک بات جو سرسید اور مولانا کو ایک دوسرے سے جدا اور متمائز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید عامۃ الناس سے بڑا گہرا قریبی اور ہمہ وقت کا تعلق رکھتے تھے، ان میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی جیسے ان ہی میں سے ہوں۔ ان کے پاؤں زمین میں بڑی مضبوطی سے گڑے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ چھوٹے بڑے ہر پیمانے پر سوچتے تھے اور اسی کے مطابق کام کرتے تھے۔ سرسید کے عہد میں مسلمانوں پر غدر کی تباہ کاریوں کا شدید اور عالمگیر اثر تھا۔ سرسید کا کمال اور کارنامہ یہ تھا کہ دور اور دیر کی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے علاوہ، موقع آن پڑتا تو وہ فرسٹ ایڈ (حادثے پر فوری چارہ سازی) بھی کرتے۔ سرسید کے اس فرسٹ ایڈ کو ان کے بعد آنے والوں نے خود غرضی یا ناسمجھی کی بنا پر مستقل علاج سمجھ لیا اور کبھی لازمۂ صحت!

مولانا ابوالکلام عوام کے آدمی نہ تھے۔ کتنے خواص کو بھی ان کے ہاں عوام کے درجے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا! شاید انھوں نے اقبال کے عقاب کی طرح چٹانوں کی بلند و ویران تنہائیوں میں اپنی دنیا بنا رکھی تھی۔ یہ بحث آگے بھی آئے گی۔

یہاں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا گیا ہے، مولانا ان تحریکوں کی تائید میں نہ تھے! یونیورسٹی جن شرائط پر یا جن حالات میں قبول کی گئی، اس کے خلاف مولانا کی لکھنؤ میں جو تقریر ہوئی اور اس پر جو مضامین انھوں نے سپرد قلم کیے وہ کچھ اور نہیں تو بے مثل خطابت، شدید طنز اور اعلیٰ انشا پردازی کے اعتبار سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد جب حالات دگرگوں ہوئے تو مسلم یونیورسٹی کو ہر گزند سے محفوظ رکھنے میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں وہ بھی اس ادارے کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔ ان میں سے ایک ذاکر صاحب کو علی گڑھ کی وائس چانسلرشپ قبول کرنے پر آمادہ کرنا بھی تھا۔ حالات و حادثات کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ ذاکر صاحب اور مولانا دونوں علی گڑھ کے خلاف تھے لیکن وقت آیا تو ان ہی دونوں کو اس کی حمایت و حفاظت کے فرائض ادا کرنے پڑے! "بت خانے" کی یہ "کرامت" کیا کم ہے،

کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد!

ایسے لوگ کم دیکھے گئے ہیں جو اس کم عمری میں اپنے آپ کو دنیا کے راستوں پر نہیں بلکہ دنیا کو اپنے راستے پر چلنے کے لیے تیار کر لیتے ہوں۔ مولانا ابوالکلام ایسے ہی تھے۔ دنیا کے راستے پر چلنے والے دنیا کے اشارے کے محتاج ہوتے ہیں، مردان کار آگاہ، کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کیلئے خود دنیا ان کے اشارے کی محتاج و منتظر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا تمام عمر خود کسی کے مشورے یا مدد کے خواستگار نہیں ہوئے، ان کی مدد اور مشورے کے محتاج و منتظر دوسرے رہے۔

وہ صرف اپنے بنائے ہوئے معیار خوب وزشت کی پابندی کرسکتے تھے!

مولانا عزلت نشین، دیر آشنا اور کم آمیز تھے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کے "خاصان بارگاہ" سب سے کنارہ کش ہو کر زندگی کا وہ زمانہ جو ترغیبات نفس کے اعتبار سے غفلت اور غلبے اور ضمیر و دانش کے اعتبار سے نیم رس ہوتا ہے، عبادت و ریاضت میں گزارتے ہیں۔ اس خلوت، عبادت اور ریاضت (اعتکاف) کا مقصد مطالعۂ ذات اور محاسبۂ نفس ہوتا ہے، اس سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کا کیا مشن ہے اور وہ خلق خدا کی کس خدمت پر مامور (من اللہ) ہونے والے ہیں۔ ان مراحل سے گذرنے کے بعد وہ دعوت حق اور خدمت خلق کے لیے عامۃ الناس میں آتے ہیں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مولانا اپنی زندگی کے کسی خاص عہد میں اس مرحلے و منزل سے گزرے یا نہیں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس مطالعے اور مجاہدے میں کسی نہ کسی حد تک مولانا آخر دم تک منہمک رہے۔ اپنے محاسبے کے لیے اپنی کمینگاہ میں بیٹھنا ایک بات ہے۔ اور بہت بڑی بات ہے اور اپنی بنائی ہوئی جنت یا خانقاہ میں بیٹھنا قطعاً دوسری بات ہے اور بہت معمولی بات ہے۔ اول الذکر حالت وسیلہ ہے ایک بڑے مقصد کا اور موخر الذکر بجائے خود ایک مقصد ہے لیکن ادنیٰ مقصد ہے۔ ایک پناہ لینا ہے، دوسرا بے پناہ بننا ہے! اتنا سب ہم جانتے ہیں کہ مولانا کا مزاج خانقاہی نہ تھا۔ آخرت میں مولانا کے ساتھ جنت کیا سلوک کرے وہ تو مجھے نہیں معلوم، دنیا میں تو مولانا نے جنت کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا!

مولانا کی رہبری میں پیغمبرانہ طریق دعوت کے بجائے آمرانہ شان اور کبریائی کی ادا تھی، وہ اتنے پبلک کے نہیں جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مولانا اپنے آپ کو عوام سے زیادہ خواص کی راہ نمائی پر مامور سمجھتے تھے!

مولانا کا اسلوب تحریر ان کی شخصیت تھی اور ان کی شخصیت ان کا اسلوب، دونوں

کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب طرز کی ایک نشانی یہ بھی ہے! مولانا نے لکھنے کا انداز، لب ولہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے براہ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی انداز بیان اور زور کلام اور وعید و تہدید کے تازیانے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں کو رعشۂ سیماب طاری کر دیتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہ ملے گی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھی جتنی خدائی کے رول سے! خدا پیغمبروں کی طرح انسانوں میں گھلا ملا نہیں ملتا، اس لیے کہ پیغمبروں کی طرح وہ انسانوں میں پیدا سے نہیں ہوتا، اس لیے خدا کے خطاب کرنے کا انداز پیغمبر یا انسان کے طرز خطاب سے جداگانہ ہوتا ہے، یہاں پہنچکر یہ بھید کھلنے لگتا ہے کہ مولانا کی تحریروں میں انانیتی رنگ اور خطابت کا غلبہ کہاں سے آیا۔

صحف سماوی میں جو باتیں بتائی گئی ہیں، انسان نے ہمیشہ ان کو اپنی بہترین احساسات کے مطابق فنون لطیفہ میں تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی افکار کو شعر و ادب سے اور شعر و ادب کو مذہبی افکار سے سب سے زیادہ تازگی اور توانائی ملی ہے۔ فارسی اور اردو نظم میں رومی اور اقبال نے جس حرارت دینی، علمی تبحر، عصری بصیرت، شاعرانہ حسن کاری اور فنی قدرت سے کلام پاک کو متعارف کیا، اس کی جھلک اگر کہیں ملتی ہے تو ڈانٹے اور ملٹن کی نظموں میں۔ جو عیسوی تصورات مذہب کی رہین منت ہیں۔ ان مشہور عالم شعرا کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جنت اور جہنم کے اسلامی تصورات سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ کلام پاک کی تعلیمات اور تصورات کو اردو میں اس بصیرت، زیبائی و برنائی کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ اللہ کا کلام ہی نہیں بندوں کا عمل صالح بھی معلوم ہو، معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں۔ اردو میں یہ کارنامہ مولانا آزاد کا ہے!

عربی زبان کے معیار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں آغاز اسلام سے

آج تک یکساں بلند ہے جس کا سب سے بڑا سبب کلام پاک کی غیر متبدل زبان و بیان اور اس کے معانی و مطالب کا عالمگیر اثر و نفوذ ہے۔ ان قوموں سے قطع نظر جن کی مادری زبان عربی ہے بے شمار ایسے مسلمان ہیں جن کی مادری زبان کچھ اور ہے لیکن کلام پاک کی تلاوت و ترتیل، اوراد و وظائف کے التزام، مذہبی فرائض بجا لانے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر روزانہ کی زندگی میں عربی فقروں کے زبان زد ہوتے رہنے سے عربی ان کی زندگی میں دخیل اور ان کے ذہنوں میں پیوست ہو گئی ہے۔ اسکے علاوہ مسلمانوں کے چھوٹے بڑے بے شمار عربی مدارس ہیں جہاں قدیم زمانے سے آج تک اسکی مکمل تعلیم دی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی، تصنیفی اور ادبی زبان بھی عربی تھی۔ ایک حد تک فارسی کو بھی یہی درجہ حاصل ہے۔

یہاں عربی اور فارسی زبانوں کی خوبیوں پر تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے، بتانا صرف اتنا ہے کہ عربی میں کلام پاک کا ہونا عربی زبان کی شہرت اور بقا کی ایسی ضمانت ہے جس کو زوال نہیں، اور اس زبان کا صحیح عمل دخل جہاں کہیں جس زبان اور قوم میں ملے گا ان میں حسب استعداد عربی زبان اور عرب قوم کی تازگی اور توانائی بھی ملیگی۔ فارسی اور عربی شعر و ادب پر مولانا کو جو غیر معمولی عبور تھا اور ان کا ذوق جس طرح ان کی ذہن و فکر میں رس بس گیا تھا وہ مولانا کے قلم اور زبان سے اردو میں سہ آتشہ ہو کر نمودار ہوا!

یہ بات صرف عربی فارسی زبانوں تک محدود نہیں ہے، زبان کے معیار کو بلند اور کارآمد رکھنے میں الہامی اور کلاسکی زبانوں کی اہمیت مسلم ہے بشرطیکہ اور یہ بہت بڑی شرط ہے کہ ان زبانوں کا اثر اور ان کی افادیت بولنے اور لکھنے والوں کی عملی زندگی میں مسلسل اور موثر طریقے برتی ہو۔ زبان اپنے حسب نسب کے اعتبار سے ترقی کرتی ہے زبان کے بے وقوف دوستوں کے حسب نسب سے۔ وہ ترقی کرتی ہے بولنے اور لکھنے والوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھنے سے۔

سر سید، شبلی، حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، سب کے انداز میں لکھنے والے ہمارے یہاں مل جائینگے لیکن مولانا کا پیرو ایک نہ ملے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیرو کا نہ ملنا مولانا کی بڑائی میں کوئی اضافہ ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا کا اسٹائل ادب اردو کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں یا اسکی افادیت کی عمر ختم ہو چکی یا مولانا کی تحریروں میں اسٹائل کا غلبہ اور مواد کی کمی ہے یا مولانا کے مضامین کا ترجمہ کسی ایسی زبان میں، جو عربی فارسی کی جینیس (Genius) سے ناآشنا ہو، کامیاب ہوگا تو میں اس سے "جدال سعدی" قسم کی تفریح پر بھی آمادہ نہ ہوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ بے مثل اسلوب جس میں "عجم کا حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں" کے ساتھ "شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی" بھی ملتا ہے، مولانا پر ختم ہو گیا۔ ایک جگہ عرفی نے اپنے انداز خاص سے ماتم کیا ہے کہ تمام شہر و دیار چھان ڈالے لیکن "نیافتم کہ فروشند بخت در بازار"! نصیبے کی طرح اسٹائل کا بھی یہی حال ہے بالخصوص مولانا کے اسٹائل کا!

صحافت کو ادب میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اس کی سرگرمیاں بالعموم روزمرہ کے حالات و حوادث پر رائے زنی تک محدود ہوتی ہیں۔ مسائل حاضرہ پر تبصرہ اور خبریں پڑھ کر ہم دوبارہ اخبار کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اخبار کے بارے میں کبھی کبھی ایک کہاوت بھی سننے میں آجاتی ہے یعنی اتنا باسی جتنا کہ گذرے ہوئے دن کا اخبار! ہمارے بعض بڑے اچھے شاعر اور نثر نگار صحافت کے نشے یا طلسم میں ایسے اسیر ہوئے کہ آخر تک نکل نہ پائے اور انکی تحریریں "صحافتی" قرار پائیں۔

مولانا کا ابتدائی عہد (جنگ بلقان سے پہلی جنگ عظیم تک) اردو صحافت کا زریں دور تھا۔ گذشتہ پچاس سال میں اردو کے اچھے سے اچھے اخبار اور ان کے مدیر قوم اور ملک سے روشناس ہوئے جنھوں نے اردو جرنلزم کو بڑی ترقی دی، لیکن سوائے مولانا کے کسی اور کو ایڈیٹر کی حیثیت سے ادب کی صف اول میں جگہ نہ ملی اور صرف الہلال اور البلاغ کے مضامین کو علمی اور ادبی درجہ نصیب ہوا۔

بذات خود میں نہ مولانا کو متداول معنوں میں صحافی سمجھتا ہوں نہ الہلال اور البلاغ کو صرف اخبار۔ مولانا کسی مسئلہ پر نہ سرسری طور سے غور کرتے تھے نہ اظہار خیال۔ بلکہ اس کا التزام رکھتے تھے کہ جو بات کہی جائے وہ مسلمات کی روشنی کی تاب لا سکے، کسی بڑی حقیقت سے رشتہ رکھتی ہو اور علمی و ادبی معیار پر صحیح اترے۔ ادارت کے مصروف پروگرام اور گریز پا لمحات میں اس التزام کا نباہنا تقریباً ناممکن ہے، صرف مولانا ایسا کر سکتے تھے۔ اردو صحافت کو مولانا نے کلاسکس کا درجہ عطا کیا۔ مولانا کی تحریر صحافتی نہیں تصنیفی ہوتی تھی، نظر حکیمانہ، انداز خطیبانہ اور آہنگ ملہمانہ! ان کی تحریروں، تقریروں نیز ان کے سراپا کا جب کبھی خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ازمنۂ قدیمہ میں یونان کے زندہ جاوید رزمیہ نگار مصروف کار ہوں۔ اپنے زمانے اور اپنے دیار میں مولانا یونانی دیوتاؤں سے کم نہ تھے!

مولانا کے ہاں انشا پردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں۔ الہلال میں دعوت دار و رسن ہے، تذکرے میں دعوت دید و شنید، غبار خاطر میں دعوت نوش و نشید، تفسیر قرآن کا لب و لہجہ علمی اور عالمانہ ہے،

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا!

غالباً الہلال اور تذکرہ ہی کے زمانے میں مولانا نے تفسیر کا کام شروع کر دیا تھا۔ کلام پاک کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے لیکن تفسیر کا کام بدرجہا مشکل اور نازک ہے اسلیے کہ اس میں عربی زبان و بیان پر عبور ہونے کے علاوہ اقوام عالم کی تاریخ پر نظر، عقیدے کی محکمی اور سیرت کی پختگی و پاکیزگی لازمی شرائط ہیں۔ تفسیر میں مفسر کے نقطۂ نظر کا راہ پا جانا جتنا نامناسب ہے اتنا ہی ناگزیر بھی ہے۔ تفسیر میں ایسے مقامات اکثر آتے ہیں جہاں تاویل و تعبیر کے ایک سے زیادہ پہلو نکلتے ہیں۔ چنانچہ الہامی اور مذہبی کتابوں پر معتقدین اور منکرین نے بربنائے اعتقاد یا انتقاد اب تک جتنے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاید ہی کسی اور نوعیت کی کتاب کے بارے میں دیکھنے میں آئیں، تفسیر لکھنے والوں کا کبھی کبھی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی تاویل کلام الٰہی میں پا لیں۔ مولانا نے اپنی تفسیر میں (جو شاید پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی) اس کا لحاظ رکھا ہے کہ کلام الٰہی میں اپنے نقطۂ نظر کا جواز

نکالنے کے بجائے کلام پاک ہی کے نقطۂ نظر کو پانے اور پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام بڑی دیانت اور جرأت کا ہے!

قلعۂ احمد نگر کے ایام اسیری میں مولانا کا غبار خاطر لکھنا ایک عجیب مطالعہ ہے۔ غبار خاطر کہنے کو تو مولانا کے خطوط ہیں اور نواب صدر یار جنگ مرحوم کے نام لکھے گئے ہیں لیکن مولانا کے انداز طبیعت کو مد نظر رکھتے ہوئے اکثر ایسا محسوس ہوا جیسا مولانا نے یہ خطوط دراصل اپنے ہی نام لکھے ہوں اسلیے کہ یہ اتنے خطوط نہیں معلوم ہوتے جتنی خود کلامی! مولانا اپنے سوا کسی سے اتنے بے تکلف نہیں ہو سکتے تھے کہ اسکو ایسے خطوط لکھتے۔ اپنے سے بھی مولانا بڑی مشکل سے بے تکلف ہوتے تھے!

یہاں پہنچکر کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے کسی نے اپنے عزیز یا دوست سے دانستہ یا نادانستہ تمام عمر بے التفاتی برتی ہو لیکن آخر میں تلافی مافات کا خیال آئے تو اس پر نوازشوں کی بارش کر دے۔ مولانا نے سیاست کے خارزار اور قومی زندگی کی بے آب و گیاہ وادی میں تمام عمر اپنے نفس کو ہر لذت سے محروم اور ہر محرومی سے دو چار رکھا لیکن آخر زمانے میں جب اس فروگذاشت کا خیال آیا تو اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرنا شروع کر دیا، چنانچہ یہ خطوط ایک طور پر نتیجہ ہو سکتے ہیں مولانا کے اپنے نفس سے بدلے ہوئے خوش گوار رویے کا!

دوسری بات جو مولانا کی انشا پردازی کے بارے میں ان خطوط سے منکشف ہوتی ہے وہ انکی طبیعت کا انبساط اور شگفتہ، شاداب اور صحت مند انشا پردازی پر انکی غیر معمولی قدرت ہے۔ غبار خاطر میں مولانا کی حسن طبیعت کا وہ اظہار ملتا ہے جو رقعات غالب میں غالب کا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غبار خاطر سے پہلے مولانا کی انشا پردازی پر ابتدا سے جو خطیبانہ اور ملہمانہ رنگ طاری تھا اس کا فشار اگر بالکل دور نہیں تو بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ غبار خاطر وجود میں نہ آتا تو مولانا کی شخصیت اور انشا پردازی کا ایک بڑا دل آویز پہلو ہماری نظروں سے اوجھل رہتا۔

الہلال اور تذکرہ کے عہد میں مولانا کا جو اسلوب تحریر ملتا ہے وہ اقتضائے زمانہ کے مطابق تھا، اور اپنی خوبی اور خوبصورتی کے باوجود زمانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ لیکن غبار خاطر کا اسلوب اردو میں نا معلوم مدت تک زندہ رہے گا۔ اکثر بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے، کاش اس اسلوب کے ساتھ مولانا کچھ دن اور جئے ہوتے۔ پھر ہمارے ادب میں کیسے کیسے نسرین و نسترن اپنی بہار دکھاتے اور خود مولانا کے جذبۂ تخیل کی کیسی کیسی کلیاں شگفتہ ہوتیں!

ملک کی آزادی کی تحریک میں مسلمان اکابر کو اسیری نصیب ہوتی تو بالعموم ان کا ذہن مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی طرف مائل ہوتا۔ ان میں سے اکثر اپنے تاثرات بھی قلم بند کرتے۔ آزاد فضا کی حشر زائیوں کے بعد جیل کی ساکن، بے رنگ اور ویران زندگی کی معمولات کا سامنا ہو تو اسیروں کا افکار اور جذبات کی اپنی بنائی ہوئی بے کنار و بو قلموں دنیاؤں میں پناہ لینا فطری ہے، جو ان کو پہلے نصیب نہ ہوتی۔ مسلمانوں ہی پر موقوف نہیں، یہ صورت حال سب پر گزری ہے۔ کسی نے لڑکی کو خطوط لکھے، کسی نے بیوی کو، کسی نے اپنے آپ کو!

قیاس یہ ہے کہ جس زمانے میں مولانا رانچی میں نظر بند تھے، تفسیر کا کام جس کی ابتدا الہلال اور البلاغ کے صفحات سے ہو چکی تھی، بڑی تندہی سے شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں مولانا کی سرگرمیاں تمام تر سیاسی، مذہبی یا مذہبی سیاسی نوعیت کی تھیں، یعنی کبھی کشتی سیاسی ہوتی بادبان مذہبی ہوتے اور کبھی اس کے برعکس۔ جہاں تک خیال ہے، یہ تفسیر ناتمام رہی اور صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ رانچی سے احمد نگر تک کی مدت اتنی تھی کہ یہ کام مکمل ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور آخری اسیری کا زمانہ مولانا نے کتاب الہی کی تفسیر لکھنے کے بجائے "کتاب دل" کی تفسیر لکھنے میں صرف کیا! ایسا تو نہیں کہ زندگی کے آخری دور میں مولانا "لازمانی" اور "لامکانی" کے بجائے "زمینی و زمانی" ہو گئے ہوں، اگر ایسا ہے تو یہ تبدیلی بڑی مبارک اور انقلابی تھی!

جیسا کہ اس سے پہلے ظاہر کر چکا ہوں، تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے وہ تنہا سہارا رہ گئے تھے۔ حکومت کے بڑے اہم منصب پر فائز رہ کر اور بے شمار رکاوٹوں میں گھرے ہونے کے باوجود مولانا نے یہ فرض جس خوبی سے انجام دیا وہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا کے اٹھ جانے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ منصب ان پر ختم ہو گیا ہو!

یہاں پہنچ کر یہ بات بھی دل میں آتی ہے کہ حکومت کیسی ہی ہو، آزادی اور تندہی سے قوم کی

خدمت کا کام حکومت سے باہر ہی رہ کر زیادہ موثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے، کچھ اور نہیں تو اس بنا پر کہ حکومت میں رجعت پسندی اور عامۃ الناس میں ترقی پسندی کی استعداد خلقی ہے۔ اول الذکر کی تقدیر سکونی ہے، مؤخر الذکر کی حرکی!

قطع نظر اس سے کہ مولانا حکومت سے کس درجہ وابستہ ہو گئے تھے، اس سے باہر نکل سکتے بھی تھے یا نہیں، ان کو نکلنے بھی دیا جاتا یا نہیں یا ان کی صحت اس کی کہاں تک متحمل ہوتی۔ کبھی کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے، کاش وہ حکومت کے محدود اور گلو افشار حلقے سے باہر نکل کر ہندی جمہوریہ کی دستور میں ہندی مسلمانوں کو وہ مشکل لیکن مہتم بالشان مقام دلا سکتے جو مسلمانوں کا حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی!

جی ایسا کیوں چاہتا ہے، شاید اس لیے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی سردار دور دور ایسا نظر نہیں آتا جس کے سپرد ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی ذمہ داری اعتبار و افتخار کے ساتھ کی جا سکے!

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!

موج کوثر

یہ اردو و فارسی کے مشہور روزگار نعت گو شاعر مولانا اقبال سہیل کی دو نعتیہ نظموں کا مجموعہ ہے، جس کو بڑے اہتمام و نفاست کے ساتھ جناب افتخار اعظمی نے چھپوا کر مرکز ادب لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔ تقطیع خورد قیمت ۸/

پتہ:- مرکز ادب، جہانگیر آباد پیلس، لکھنؤ۔

مطبوعات جدیدہ

حیات امام احمد بن حنبلؒ ۔ تالیف الاستاذ محمد ابوزہرہ ترجمہ مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ندوی، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۵۰۸ مجلد مع گردپوش قیمت عـہ پتہ: المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور۔

ائمہ میں امام احمد بن حنبلؒ کو علم و فضل، زہد و تقویٰ، ہمت و عزیمت اور اتباع طریقۂ سنت و سلف میں امتیازی درجہ حاصل ہے، استاذ محمد ابوزہرہ نے جو مصر کے مشہور اور محقق عالم، قاہرہ یونیورسٹی میں قانون اسلامی کے پروفیسر اور ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں، امام صاحب کے حالات میں ایک فاضلانہ اور محققانہ کتاب لکھی ہے جس میں ان کی جملہ علمی و عملی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں امام کی عظمت و برتری، عام سوانح، دور ابتلا، اخلاق و سیرت، اساتذہ و شیوخ اور اس زمانہ کے مختلف اسلامی فرقوں کا ذکر ہے، دوسرے حصہ میں امام موصوف کے مسلک و مذہب، افکار و آراء، عقائد و خیالات، ملی سیاست، فقہ و حدیث، المسند پر تبصرہ، فقہ حنبلی، اس کے ناقلین، اس کی امتیازی خصوصیات، حنبلیت کی حقیقت، مشہور علمائے حنابلہ، ان کے کارناموں، مذہب حنبلی کی نشر و اشاعت اور اسکی اہم کتابوں کا تذکرہ ہے، اردو میں اس موضوع پر کوئی جامع اور محققانہ کتاب نہیں تھی، اس لیے ضرورت تھی کہ اس کا ترجمہ کیا جائے، اس مفید کام کو مولانا رئیس احمد صاحب جعفری نے انجام دیا ہے۔ اور کتاب کے ناشر مولانا عطاء اللہ حنیف نے ضروری حواشی لکھکر اور بعض مقامات پر مصنف کی فکری غلطیوں کی نشاندہی کر کے اس کو اور زیادہ مفید بنا دیا ہے، اس اہم کتاب سے امام جلیل کی پوری شخصیت عظمت، اور کارناموں کی تفصیل سامنے آجاتی ہے، فاضل مترجم کا نام ترجمہ کی روانی و خوبی کی ضمانت ہے، اللہ تعالیٰ مترجم اور ناشر دونوں کو اس علمی و دینی خدمت کا صلہ عطا کرے۔

احکام سلطانیہ ۔ تالیف علامہ ابوالحسن ماوردی، ترجمہ جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۰۶ مجلد مع گردپوش، قیمت ـلـے ناشر محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔

امام ابوالحسن ماوردی کی تالیف "الاحکام السلطانیہ" اسلامی سیاست و قانون حکومت پر ایک مبسوط اور مستند کتاب ہے، اس کا پہلا اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا تھا، مفتی صاحب نے اسے مزید حذف و اضافہ کے بعد شائع کیا ہے، اصل کتاب ۲۰ ابواب پر مشتمل تھی، لائق مترجم نے مقدمہ ابن خلدون وغیرہ کی مدد سے ایک باب "آداب حکمرانی" کا اضافہ کیا ہے، شروع میں مصنف کے مختصر حالات اور حکومت الٰہیہ کی مختصر توضیح کی ہے، کتاب کی اہمیت و افادیت کیلیے یہ کہدینا کافی ہے کہ اس میں اسلامی نظام حکومت کے جملہ شعبوں مثلاً امارت، وزارت، فوج، قضاء، فوجداری، جزیہ و خراج، امامت صلوٰۃ، تحصیل زکوٰۃ، امیر حج کا تقرر، تقسیم غنیمت، موات، چراگاہ، پڑاؤ، اقطاع اور دفاتر وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اس کتاب کی اشاعت ایک مفید علمی اور دینی خدمت ہے۔

عورت اسلامی تعلیمات کے آئینے میں ۔ مرتبہ منشی عبدالرحمٰن خانصاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، ضخامت ۲۲۳ صفحات، مجلد مع گردپوش، قیمت للعہ ناشر ایم ثناء اللہ خاں اینڈ سنز ۲۶ ریلوے روڈ، لاہور۔

اسلام کے علاوہ دوسرے مذہبوں میں عورت کو نہایت حقیر اور مردوں کا محکوم سمجھا جاتا ہے، اسلام نے

عورت کو اس کے جائز حقوق اور صحیح مقام عطا کرکے اس کی مظلومی ختم کردی، لائق مصنف نے عورت کی حیثیت پر یہ کتاب تالیف کی ہے، مگر غالباً وہ عورت کی مظلومی اور اس کے ساتھ مردوں کے ناروا سلوک سے بہت زیادہ متاثر ہیں اور کتاب کی تالیف و ترتیب کا سبب بھی یہی ہے، اس لیے ان کا فرض تھا کہ اسلام میں عورت کی جو صحیح حیثیت ہے، پہلے اسے بیان کرتے، اور کسی حد تک انھوں نے ایسا کیا بھی ہے، مگر ان کا قلم شدت تاثر سے اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے، چنانچہ مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات کے ثبوت میں عورتوں کی خلقی اور فطری کمزوریوں کا بھی انکار کردیا ہے، اور اس کے لیے ان کو قرآن پاک کی بعض آیات کی غلط تفسیریں کرنی پڑی ہیں، اس غلطی سے قطع نظر کتاب مفید اور اس میں عورت کے متعلق صحیح چیزیں بھی ہیں۔

تذکرہ شعرائے جے پور۔ مرتبہ جناب احترام الدین احمد صاحب شاغل، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۵۲۶ مجلد۔ قیمت ؎ ۔ ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔

اردو پورے ہندوستان کی زبان ہے، ملک کا کوئی خطہ اس زبان کے اہل کمال اور ارباب فن سے خالی نہیں، دلی، لکھنؤ، عظیم آباد، حیدر آباد، رام پور اور لاہور کی طرح راجپوتانہ کی قدیم ریاست کا یہ دار السلطنت بھی اردو شعر و ادب کا مرکز رہ چکا ہے، ۱۸۵۷ء میں جب دلی پر تباہی آئی تو بعض ارباب کمال نے جے پور میں پناہ لی اور یہاں ان کی بدولت شعر و سخن کا بازار گرم ہوا، ضرورت تھی کہ اردو کے دوسرے مرکزوں کی طرح یہاں کے شعراء کا بھی تذکرہ مرتب کیا جاتا، لائق مرتب جو ایک باذوق صاحب قلم اور شعر و ادب کے دلدادہ ہیں، نے یہ تذکرہ مرتب کرکے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے، اس میں تقریباً ایک صدی کے سوا دو سو شاعروں کے حالات، تصانیفِ نظم و نثر، نمونۂ کلام اور اس کی خصوصیات پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے، شروع میں ادب جے پور کے ماضی و حال کے عنوان سے اس ریاست کی مختصر تاریخ، اس کے راجاؤں کی علم و ادب نوازی، اہم مشاعروں، انجمنوں، ادبی

شخصیتوں اور دوسری علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ کیا ہے، اس طرح یہ تذکرہ مختصر مگر جامع ہے، اس سے جے پور کی علمی و ادبی حیثیت، وہاں اردو زبان کی مقبولیت، شعراء اور ارباب فن کے متعلق مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں، لائق مرتب نے اسے ترتیب دیکر ایک مفید ادبی، لسانی اور تاریخی خدمت انجام دی ہے۔

فسانۂ عبرت۔ تالیف مرزا رجب علی بیگ سرور، مرتبہ جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۲۸، قیمت عہ، پتہ کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنؤ۔

مرزا رجب علی بیگ سرور اردو زبان کے مشہور اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے، ان کی کتاب "فسانۂ عجائب" بے مثل اور اس سے ان کے نام کو دوامی شہرت ہوگئی ہے، اس کے علاوہ بھی سرور کی کئی کتابیں ہیں۔ "فسانۂ عبرت" ان میں بعض حیثیتوں سے زیادہ قابل قدر اور واقعی فسانۂ عبرت ہے، اس میں اودھ کے آخری چار بادشاہوں یعنی نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے حالات، شاہی تفریحوں، تقریبوں، ثقافتی اور تہذیبی امور وغیرہ کا تذکرہ ہے، جو عام تاریخوں میں نہیں ملتے، یہ کتاب اب نایاب تھی اس لیے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی نے اس کو کسی قدر ترمیم کیساتھ دوسرے نسخوں سے تصحیح کرکے شائع کیا ہے، سرور کا مسجع و مقفی طرز اگرچہ اس زمانہ کے ذوق کے مطابق نہیں ہے، مگر اس میں زبان و ادب کا پورا لطف ملتا ہے، شروع میں رضوی صاحب کے قلم سے ایک دیباچہ ہے جس میں سرور کی عام تصنیفات خصوصاً اس کتاب کے متعلق ضروری اور مفید معلومات ہیں، فاضل مرتب نے اسے شائع کرکے ایک ادبی اور تاریخی خدمت انجام دی ہے۔

تگ و تاز۔ از جناب ابو المجاہد صاحب زاہد، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، مجلد قیمت عاؔ، پتہ ادارۂ ادبیات نو ۲۳۳ یحییٰ گنج، لکھنؤ۔

تگ و تاز جناب ابو المجاہد کی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے، جس سے ان کے پاکیزہ مذاق، صالح فکر اور شاعرانہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، آجکل شعر و ادب کا موضوع زیادہ تر عریانی ہے لیکن

زاہد کا یہ مجموعہ صالح اور تعمیری ادب کا ترجمان ہے، اور ان کی شاعری اسلامی خیالات، پاکیزہ جذبات اور شایستہ اخلاق پر مشتمل ہے اور وہ کہیں اس "مقصد" کو نظر انداز نہیں کرتے، ان معنوی محاسن کے ساتھ وہ ادبی خوبیوں سے بھی آراستہ ہے، لیکن کہیں کہیں زبان و ادب کی بعض فروگذاشتیں ہیں، اس مجموعہ میں بعض نظمیں مثلاً "مزدور" اور "اے زہرہ جبیں ناچ" وغیرہ ان کے سنجیدہ ذوق کے خلاف ہیں۔ تاہم مجموعی حیثیت سے مجموعہ قابل قدر اور محاسن کے مقابلہ میں معائب معمولی ہیں۔ شروع میں جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی کا ایک دیباچہ ہے، جس میں زاہد کی شاعری کا تعارف اور نفس شاعری کے متعلق مفید باتیں آگئی ہیں۔

محبوب کبریا کی آمد۔ مرتبہ جناب سید اشفاق حسین صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۶، قیمت عہ پتہ سید اشفاق حسین رضوی، کوچہ میرانیس، لکھنؤ۔

اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے اور شروع میں خدا کی کاریگری اور رسولوں کے بھیجنے وغیرہ کا تذکرہ ہے، مرتب نے "باخدا دیوانہ باش با محمد ہوشیار" پر عمل کرتے ہوئے توحید و رسالت کے حدود کا خیال رکھا ہے، کتابچہ اگرچہ مفید ہے لیکن سادہ بیانی کے بجائے رنگین اور پرتکلف عبارت اور مترادف الفاظ اور جملوں کی بے جا کثرت ہے۔

رہبر کامل۔ مرتبہ مولوی عبد المجید صاحب اصلاحی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰، قیمت ۳ روپے ۹ نئے پیسے۔ پتہ مکتبۃ الاسرار، کوزہ گھنی سوہن، اعظم گڈھ

سیرت پاک پر چھوٹی بڑی بیشمار کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ یہ نئی کتاب تدریسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے جس میں حیات نبوی کے اہم گوشوں اور واقعات کو سادہ اور آسان پیرایہ میں تحریر کیا گیا ہے، کتاب مفید اور اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

"ض"